قرآنی نظامِ ربوبیت کے پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا خصوصی شمارہ

پرویزؒ نمبر

ستمبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ طلوعِ اسلام میں ادارہ کی طرف سے پرویزؒ نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ جن احباب نے اپنے مضامین ارسال کیے ہیں ادارہ اُن کا تہِ دل سے شکر گذار ہے۔

یہ خصوصی شمارہ جو اس کی ماہانہ اشاعت کے علاوہ ہوگا، محترم پرویزؒ صاحب کی یاد میں فروری ۱۹۸۹ء میں منعقد ہونے والی تقریب پر نکالنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ لہٰذا احباب سے درخواست ہے کہ محترم پرویزؒ صاحب کی زندگی سے متعلق اپنی ذاتی یاد داشتیں خواہ وہ اُن کی نجی محفلوں کے بارے میں ہوں، اُن کی قرآنی فکر سے متعلق ہوں یا تحریکِ پاکستان کے دوران اُن کی خدمات کے تذکرہ پر مبنی ہوں، جلد از جلد ادارہ میں بھجوا دیں، تاکہ انہیں اس شمارہ کی زینت بنایا جا سکے۔

خیال رہے کہ تدوین و ترتیب اور کتابت و اشاعت کے مراحل کے پیشِ نظر یہ مضامین زیادہ سے زیادہ ۱۵ر جنوری ۱۹۸۹ء تک ادارہ میں موصول ہو جانے چاہئیں۔

شکریہ

ایڈیٹر ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

تحریکِ طلوعِ اسلام کا ایک اور ناقابلِ تلافی نقصان

ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام، محترم محمد لطیف چوہدری صاحب کی اہلیہ محترمہ، طویل علالت کے بعد، ۱۸ نومبر ۱۹۸۸ء کو وفات پا گئیں ۔

مرحومہ ایک نہایت ہی خلیق ملنسار اور شفیق خاتون تھیں ۔ شاید ہی کوئی ملنے والا ان کے اعلیٰ اخلاق سے متاثر نہ ہوا ہو ۔ ان کی تحریکِ طلوعِ اسلام کے ساتھ وابستگی قابلِ رشک تھی ۔ ان کی زندگی میں ایسا موقع کم ہی آیا ہوگا کہ محترم لطیف صاحب اکیلے درس سننے آئے ہوں، وہ ہمیشہ ساتھ ہوتیں ۔

لیکن ایک اور حقیقت جو غالباً بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگی اور جس سے مجھے بھی کچھ عرصہ پہلے ہی آگہی حاصل ہوئی یہ ہے کہ محترم لطیف صاحب کو دامنِ فکرِ پرویز ؒ میں لانے کا سہرا اُن کی اہلیہ محترمہ کے سر ہی تھا ۔ محترم لطیف صاحب کو اوائل عمر ہی سے مطالعہ کا شوق رہا ہے اور وہ اکثر ادبی رسائل اور کتب گھر لے آتے تھے ۔ مرحومہ ان میں طلوعِ اسلام بھی رکھ دیا کرتی تھیں اور جب محترم لطیف صاحب استفسار کرتے کہ یہ کیا؟ تو محبت سے کہا کرتیں ذرا اسے بھی دیکھ لیجیئے ۔ آخر ان کی کوششیں رنگ لائیں اور محترم لطیف صاحب جو آج ناظمِ ادارہ کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں بھرپور اور والہانہ انداز میں فکرِ پرویز ؒ سے منسلک ہو گئے ۔ کیسی خوش بخت تھیں مرحومہ جو اپنے رفیقِ سفر کو قرآن کی بارگاہ میں لے آئیں ۔ ان کی اس کامیابی پر یقیناً اللہ کی کائناتی قوتوں نے ان کا یہ کہہ کر استقبال کیا ہوگا کہ :۔

یا أیتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربك راضیۃً مرضیۃً فادخلی فی عبادی وَادخلی جنتی ۔

میرے دل میں بھی مرحومہ کا ایک خاص مقام تھا ۔ اوّلاً انکے مذکورہ کارنامے کی بنا پر اور ثانیاً میری سب سے چھوٹی بیٹی کی خواشدامن ہونے کے رشتہ سے ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مرحومہ کے نقوشِ قدم پر چل کر اپنی کتابِ عظیم کا پیغام بنی نوعِ انسان تک پہنچاتے رہنے کی سعادت سے نوازتے رہیں ۔

جگر فگار
محمد عمر دراز

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

مجلسِ ادارت

مدیر مسئول : مرزا محمد خلیل

معاونین : ثریا عندلیب
محمد عمر دراز

ناشر : شیخ عبدالحمید

طابع : خالد منصور نسیم

مطبع : النور پرنٹرز و پبلشرز
۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵
ٹیلیفون ——— ۲۷۵۸۲۶

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۱ دسمبر ۱۹۸۸ء شمارہ ۱۲

بدل اشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۶۰ روپے
بیرونی ممالک ——— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے
فی پرچہ : -/۵ روپے

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱
پوسٹ کوڈ ———
ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

۱۔ لمعات :۔ قومی انتخاب ۱۹۸۸ء ۴
۲۔ اسلام کا نظامِ عدل و احسان — محمد عمر دراز ۱۱
۳۔ فاذکرونی اذکرکم — دین الحق قاضی ۲۵
۴۔ شریعت کسے کہتے ہیں؟ — خالد عمر دراز ۲۷
۵۔ لندن میں یوم پاکستان ۱۹۸۸ء کی تقریب۔ — نمائندہ بزم لندن ۲۹
۶۔ دین کی باتیں — ثریا عندلیب ۳۱
۷۔ ربطِ باہمی — بشیر احمد عابد ۳۴
۸۔ آئینہ قرآن — محمد عمر دراز ۴۰
۹۔ قرآن اور سیاست (حصہ اول۔ لا الٰہ) — خالد محمود سید ۴۵
۱۰۔ قیامِ دین کا مفہوم — محترم پرویز صاحب ۶۴
۱۱۔ بابُ المراسلات — سید حامد علی حیدرآباد ۶۸
۱۲۔ حقائق و عبر ۷۲
i۔ حنیفاں کے آبا ii۔ جنّتی تعوید iii۔ امام ابن حزم ظاہری iv۔ حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی v۔ سگریٹ نوشی اور علماء vi۔ اسلام کے نام پر سرمایہ دارانہ نظام کی علمبرداری vii۔ خانہ کعبہ میں جی نہیں لگتا viii۔ حقِ ملکیت کے بارے میں فرقہ اہلحدیث کے خیالات میں تبدیلی ix۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا فہم حدیث۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

انتخابات ۱۹۸۸ء

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

گیارہ سال کے طویل، صبر آزما اور ہمت شکن عرصہ کے بعد آخر کار وطن عزیز میں انتخابات ہو ہی گئے۔ یہ انتخابات جس درجہ پُرامن، غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انداز میں منعقد ہوئے ہیں، ہماری ملی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے دوران ملتِ پاکستانیہ کا کردار صدرِ مملکت جناب غلام اسحٰق خان کا عزم اور ہماری جانباز بری فوج کی طرف سے امن و امان قائم رکھنے میں معاونت قابلِ صد تحسین ہیں اور ہم ان ہر سہ عناصر کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ ملتِ پاکستانیہ انتخابات کے اس طور منعقد ہونے پر جس قدر بھی فخر کرے، بجا ہے۔ پوری دنیا ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ نے، جب انتخابات کے لئے جماعتی بنیادوں کا فیصلہ دیا تو وہ مفاد پرست عناصر، جو یہ سمجھتے تھے کہ اس بنیاد پر ان کی کامیابی غیر یقینی ہے، پہلے تو حیدر آباد اور کراچی کے ہنگاموں کی آڑ میں اور بعد ازیں پنجاب کے حالیہ سیلاب کا بہانہ بنا کر سر توڑ کوششیں کرتے رہے کہ اوّل تو انتخابات کا انعقاد ہی روک دیا جائے اور جب انہیں اس میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے انہیں کچھ مدت کے لئے ملتوی کرانے کی سعیٔ ناکام کی۔ صدرِ مملکت نے بار بار اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ انتخابات کو ان کے لئے متعیّن کردہ نظام الاوقات کے مطابق ضرور کرائیں گے۔ ان عناصر کی منفی کوششوں اور صدرِ مملکت کے مثبت رویّہ کے پس

میں ملتِ پاکستانیہ ایک عجیب قسم کے ذہنی تذبذب اور بے یقینی کا شکار تھی لیکن آخر کار صدرِ مملکت کا عزم رنگ لایا اور انتخابات منعقد ہوگئے۔ یقیناً ان کا یہ عزم اور ان کا مثبت عمل ان کے نامۂ اعمال میں تحسین و آفرین کا سبب ہوگا۔ ہماری بری افواج اور اس کے ساتھ پولیس نے جس جاں فشانی سے امن واماں کی صورتحال کو قابو میں رکھا، اس کی داد نہ دینا بھی بخل ہوگا۔

انتخابات کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ ان نتائج کی تثبیت کرتے ہیں جو اوّلاً ۱۹۷۰ء میں اور بارِ دیگر ۱۹۷۷ء میں ظاہر ہوئے تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجہ کے طور پر، موجودہ پاکستان میں، پاکستان پیپلز پارٹی اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی اور ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے نتائج نے بھی پاکستان پیپلز پارٹی کو ہی ملک کی مقبول جماعت قرار دیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے، ان کے مخالف گروہوں نے مزعومہ جمہوریت کے ہر اصول کے خلاف ان نتائج کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے ملک کے طول وعرض میں ہنگامے کروائے اور ملک کے امن واماں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہ تنازعات جب برسرِاقتدار اور مخالف احزاب کی باہمی گفت وشنید اور افہام وتفہیم سے ایک فیصلہ کے قریب تھے تو اس وقت کے بری افواج کے سربراہ اور مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک ہی جھپٹ میں سب کچھ کالعدم کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔

مرحوم صدر محمد ضیاء الحق نے ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات منعقد کرانے کا وعدہ کیا لیکن قوم نے دیکھا کہ کس طرح وہ ایک نہ ایک عذر کی بناء پر انتخابات کے انعقاد کو ملتوی کرتے رہے اور اسلامائزیشن کے نام پر استحصالی قوتیں عوام کے سر پر سوار ہوتی گئیں۔ مرحوم صدر کے دورِ حکومت اور ان کے عزائم کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور بہت کچھ کہا جائیگا لیکن ہماری بصیرت کے مطابق ان کی کئی ایک خوبیوں اور اچھے کاموں کے مقابلہ میں ان کا ایک عظیم ترین قومی جرم یہ ہے کہ انہوں نے اس دوران اس مذہبی پیشوائیت کو مسلسل آگے بڑھایا اور قوم کے اعصاب پر سوار کر دیا جس کے متعلق پاکستان کا تصوّر دینے والے عظیم مفکّر علامہ محمد اقبالؒ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ:

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اسے کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اور دیکھتے ہی دیکھتے اس بانیٔ پاکستان علیہ الرحمۃ کے پاکستان میں، زندگی کے ہر گوشہ پر مذہبی پیشوائیت اقتدار حاصل کرتی گئی، جس نے ان کے متعلق واضح ترین الفاظ میں یہ فرمایا تھا کہ:-

"... تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری ملّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔"

(روزنامہ انقلاب لاہور، ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء)

بانیٔ پاکستان نے قوم پر، مسلم لیگ کا یہ کہہ کر احسان جتایا تھا کہ :-

"مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں ..... رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خودغرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں، وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے (مسلم لیگ نے) تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرا دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔"

(مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی یونین سے خطاب، ۵ فروری ۱۹۳۸ء، بحوالہ تقاریر قائدِ اعظمؒ حصہ اوّل صـ ۴۸)

تھیاکریسی (یعنی مذہبی پیشوائیت کے اقتدار) کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے واضح کر دیا تھا کہ :-

"اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔"

(تقاریر قائدِ اعظمؒ شائع کردہ شیخ محمد اشرف۔ جلد دوم صـ ۳۸۶)

قیامِ پاکستان کے بعد اپنے اس مؤقف کا اعادہ، اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ پیغام میں فروری ۱۹۴۸ء میں ان الفاظ میں کیا کہ :-

"آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ امر مسلّمہ ہے کہ پاکستان میں، کسی صورت میں بھی، تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔"

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صـ ۶۵)

لیکن وائے قسمتا کہ مرحوم صدر ضیاء الحق، جو بار بار اعلان کرتے رہے کہ وہ، بانیٔ پاکستان کے اصولوں پر پاکستان کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں، اپنے ان دعووں کے علی الرغم، مذہبی پیشوائیت کو آگے بڑھاتے رہے۔ اسلامائزیشن اور نفاذِ شریعت کے نام پر بانیٔ پاکستان کے ایک ایک اصول کے خلاف اور قرآنِ حکیم کی تعلیمات کے صریحاً برعکس کاروانِ ملت کو اس منڈھی کی طرف لے جاتے رہے جہاں اس جنس کا سودا کوئی [illegible]

[illegible] حادثہ کی بنا پر راہیٔ ملکِ عدم ہوئے اور ان کی غیر حاضری میں انتخابات ہوئے تو قوم

نے گیارہ سال پہ پہلے ہوئے احیائے اسلام کے ان نقابوں کو نوچ کر الگ کر دیا اور پھر سے اپنی تشنہ تمناؤں اور کھلی ہوئی خواہشوں کا اظہار کیا۔ جو جماعتیں مرحوم صدر ضیاء الحق کے بظاہر اسلامائزیشن لیکن بباطن تحریک پاکستان کے مخالف کی حامل تھیں، قومی سطح پر عبرتناک شکست کھا کر پس منظر میں جا چکی ہیں اور پاکستان پیپلز پارٹی عوامی امنگوں کی آئینہ وار بن کر اُبھری ہے۔

ان سطور کی تسوید تک، جو حالات سامنے آئے ہیں، ان کے پیش نظر حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قومی سطح پر کس سی پارٹی کو تشکیل حکومت کی دعوت دی جاتی ہے گو صدر مملکت کی طرف سے بار بار یہ یقین دہانی کرائی جا رہی ہے کہ دستور و آئین پاکستان کا ہر حال میں احترام کیا جائے گا اور تشکیل حکومت کی دعوت صرف اس پارٹی کو دی جائے گی جو قومی سطح پر اپنی اکثریت کا قطعی ثبوت مہیا کرے گی۔

اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی اور اسلامی جمہوری اتحاد (جو نو پارٹیوں کے ادغام پر مشتمل ہے) دو بڑی پارٹیاں بن کر سامنے آئی ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے تنہا، غیر سرکاری نتائج کے مطابق، قومی سطح پر ۲۰۴ میں سے ۹۲ اور اسلامی جمہوری اتحاد نے ۵۴ نشستیں حاصل کی ہیں۔ ان کے علاوہ جن دوسری جماعتوں کے اُمیدواروں کو قومی سطح پر کامیابی حاصل ہوئی ہے ان کی تفصیل اس طرح ہے:—

پاکستان عوامی اتحاد	۳ نشستیں	(صرف پنجاب سے)
بلوچستان نیشنل الائنس	۲ نشستیں	(صرف بلوچستان سے)
پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی	۱ نشست	(پنجاب سے)
نیشنل پیپلز پارٹی (کھر گروپ)	۱ نشست	(پنجاب سے)
عوامی نیشنل پارٹی	۳ نشستیں	(صرف صوبہ سرحد سے)
جمعیت علمائے اسلام (درخواستی گروپ)	۱ نشست	(سرحد سے)
جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ)	۷ نشستیں	(۳ سرحد سے اور ۴ بلوچستان سے)
آزاد اُمیدوار	۴۰ نشستیں	(۳ سرحد سے، ۱۲ پنجاب سے، ۱۵ سندھ سے، ۲ بلوچستان سے اور ۸ فاٹا سے)

پاکستان مسلم لیگ، جس کے سر، حصول پاکستان کا سہرا ہے، اس کارزار میں کچھ اپنی کوتاہیوں سے اور کچھ غیروں کی سازشوں سے، بحیثیت فعّال جماعت اپنا نام　　تک گنوا چکی ہے۔

سندھ میں انتخابی نتائج سے دو اہم باتیں سامنے آئی ہیں۔

اولاً: علیحدگی پسند تحریکوں کو پاکستانی عوام نے شد و مد سے رد کر دیا ہے اور ان کا کوئی اُمیدوار کامیاب نہیں ہوا اور ثانیاً مہاجر قومی تحریک ایک موثر قوت کے طور پر اُبھری ہے۔

مجموعی طور پر عوام نے پرانی اور گھسی پٹی قیادت کو مسترد کر دیا ہے اور نئی نسل کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ کی ہیں۔

مستقبل قریب میں جو پارٹی بھی قومی سطح پر اپنی واضح اکثریت کا ثبوت دیتی ہے، حکومت کی تشکیل کرے گی۔ ہم ہر دو بڑی پارٹیوں کے سربراہان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ قومی مفاد اور تحفظ و استحکام پاکستان کے پیش نظر:

(i) کوئی غیر آئینی اقدام نہ اُٹھائیں۔

(ii) برسر اقتدار آنے کی صورت میں ہر وقت یہ حقیقت سامنے رکھیں کہ مفکر پاکستان اور بانی پاکستان علیہ الرحمتہ کے ان گنت بیانات کے مطابق اس مملکت کا قیام قرآنی اصول و احکام کے نفاذ کے عزم اور ارادوں کا مرہون منت ہے اس لئے اس اہم بنیاد کو سامنے رکھ کر مملکت پاکستان کے لئے نظام زندگی انہی خطوط پہ متشکل کرنے کی سعی کریں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے، اپنی سنت کے مطابق ہمیں پھر ایک موقع دیا ہے (وہ ہمیں کئی ایک مواقع پہلے بھی عطا کر چکا ہے) اس لئے نہ تو یہاں اسلامائزیشن کے نقاب میں تھیاکریسی کا نفاذ ممکن ہو سکے گا اور نہ ہی کسی ازم کا۔

ہم تمام زعماء کو بانی پاکستان کا یہ فرمودہ یاد دلانا چاہتے ہیں جو اگست ۱۹۴۱ء میں انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے طلباء سے انٹرویو کے دوران قوم کو دیا۔

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے، جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ ہی کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ **اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے......**"

اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ اللہ کا قانون مکافات، وقفۂ مہلت ختم ہونے کے ساتھ ہی اپنا فیصلہ

نافذ کر دیتا ہے اور پھر کسی کو اس سے مفر نہیں ہو سکتا۔ اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے اور اس مملکت میں قرآن کا نظام نافذ کر دیجئے تاکہ تحریکِ پاکستان کے دوران اللہ سے کئے ہوئے ہمارے وعدے پورے ہوں ورنہ :-

.... وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝ (۴۷/۳۸)

"اور اگر تم نے روگردانی کی (اپنے عہد سے پھر گئے) تو وہ (اللہ) تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی (عہد شکن) نہیں ہو گی۔"

اللہ ہمیں اس روزِ بد سے بچائے جس دن ہماری جگہ دوسری قوم کے آنے کا اس کی بارگاہ سے حکم صادر ہو!

انتخابات کے دوران اور نتائج کے بعد، یہ مسئلہ بھی بار بار اٹھایا گیا کہ عورت سربراہِ حکومت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ (بزعمِ خویش) مذہبی پیشوائیت کہتی ہے کہ نہیں ہو سکتی۔

ہماری زندگی کے ہر دوسرے مسئلہ کی طرح، اس مسئلہ میں بھی قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل نہیں کی جاتی۔ اگر اس کا فیصلہ قرآن کریم سے لیا جائے (جو ہم پر بطورِ مسلمان فرض ہے) تو قرآن نے تو عورت پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ قرآن کریم جہاں اسلامی مملکت کے فرائض کی انجام دہی مردوں کی ذمہ داری بتاتا ہے۔ اسی آیت میں اس نے عورتوں کو بھی اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے برابر کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

ملاحظہ ہو سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۷۱ :-

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ط اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

۲۔ **تحریکِ آزادیٔ فلسطین** کے سربراہ جناب یاسر عرفات کی طرف سے آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان ماہِ نومبر ۱۹۸۸ء کا ایک اور انتہائی اہم واقعہ ہے۔ پاکستان سمیت متعدد ممالک نے اس ریاست کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس ریاست کے قیام کے اعلان کو فلسطینی عوام کے عوامیوں کی تعبیر کہا جا رہا ہے لیکن ہماری بصیرت کے مطابق یہ اقدام، اس علاقہ میں قیامِ امن کی ایک کوششِ ناتمام ہے۔

۳۔ **افغانستان** سے روسی فوجوں کے انخلاء میں تعطل ماہِ نومبر کی تیسری اہم خبر ہے۔ روس نے پاکستان پر الزام لگایا ہے کہ وہ جنیوا معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ گو یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ جنیوا معاہدہ کی خلاف ورزی میں پاکستان کا تو کوئی فائدہ مضمر نہیں جبکہ اس سے صرف اور صرف روس

کو اس شکل میں فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ وہ افغانستان میں کچھ دیر اور اپنے قدم جمائے رکھے۔ روسی رہنما مسٹر گورباچوف کا بھارت کے دورے کے دوران یہ اعلان بڑا معنی خیز ہے ایسا لگتا ہے کہ پاکستان کے حالیہ انتخابات کے نتائج کے طور پر قومی حکومت کے قیام تک، وہ تزلزل کی پالیسی اختیار کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں چین کا کردار مثبت طور پر سامنے آیا ہے جس نے اپنے حالیہ بیان سے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس علاقے میں امن کا قیام صرف افغانستان سے روسی فوجوں کے مکمل انخلاء پر منحصر ہے۔

ہم پاکستان میں برسرِ اقتدار آنے والی نو منتخب حکومت سے بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایسے اقدامات اُٹھائے گی جن سے جنیوا معاہدہ کے مطابق روسی فوجوں کا انخلاء مکمل ہو سکے اور افغانستان کی غیر جانبدار اسلامی حیثیت بحال ہو سکے۔

بقیہ شریعت کسے کہتے ہیں؟ از صفحہ ۲۸

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ جیسا کہ مرحوم صدرِ مملکت* نے نفاذِ شریعت آرڈیننس کے سلسلہ میں پاکستان ٹیلیویژن سے قوم کے نام اپنے خطاب میں کہا، "شریعت ایک کنواں نہیں ہے جس میں رسّی سے ڈول لٹکا کر جتنا پانی چاہے نکال لیا جائے بلکہ شریعت وہ راستہ ہے جو بہتے ہوئے، جوئے رواں کی طرف لے جائے۔ وہ جوئے رواں جو اپنی روانیوں سے کشتِ حیاتِ انسانیہ کو از خود سیراب کرتی ہوئی گذر جائے۔ اور جس میں سے رسّی سے ڈول لٹکا کر پانی نہ نکالنا پڑے۔

مملکتِ پاکستان کے اعلیٰ ترین منصب (کرسیٔ صدارت) سے قوم کے نام خطاب کے دوران، جسے صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں دیکھا اور سُنا جاتا ہے، اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ ہر لحاظ سے صحیح اور مستند ہو۔ کیونکہ ایسے بلند مقام سے غیر محتاط الفاظ و کلام کے استعمال سے سخت نقصان، ابہام اور اُلجھاؤ پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے۔

---

* جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم، جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو عسکری انقلاب کے بعد برسرِ اقتدار آئے آپ کا ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو بہاولپور کے فضائی حادثہ میں انتقال ہوا۔

اسلام کا نظامِ عدل و احسان

(محمد عمر دراز)

مقالہ بسلسلہ بارہویں قومی سیرت کانفرنس
اکتوبر ۱۹۸۸ء *

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

صاحبِ صدر اور حاضرینِ کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج کی اس تقریبِ سعید میں شرکت ہم سب کیلئے موجبِ صد نشاط اور باعثِ ہزار سعادت ہے کہ یہ تقریب اُس ذاتِ اقدس و اعظم علیہ التحیہ والسلام کی نسبت سے منعقد کیجا رہی ہے، جو شاہکارِ خالقِ فطرت اور عظیم ترین محسنِ انسانیت ہیں۔ اور جن کی ذاتِ بابرکت کی وساطت سے ہمیں خدائے بزرگ و برتر کا وہ ضابطۂ حیات ملا جو نہ صرف، انسانی فکر کے تخلیق کردہ تمام نظامہائے زندگی سے افضل ترین ہے، بلکہ انسان کو جن آزادیوں سے روشناس کراتا اور جن رفعتوں کی راہ دکھاتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے جس انداز کی حیاتِ انسانیہ ترکیب پاتی ہے، اُس سے بہتر تو کجا، اُس جیسی زندگی کا تصوّر بھی ناممکن ہے۔ یہ تصویر، میرے اپنے ذہن کی تراشیدہ اور میرے اپنے عقائد پر مبنی خوش فہمی نہیں بلکہ یہ اُسی نظامِ زندگی عطا کرنے والے ربّ العٰلمین کا ارشاد ہے، جو فرماتا ہے:۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۔ ۔ ۔ ۔

"اے نوعِ انسانی! تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک ایسا ضابطۂ ہدایت آگیا جو غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر کے تمہیں اس سے روکتا ہے اور ان تمام بیماریوں کا علاج ہے جن سے انسان کی سیرت میں ضعف اور کردار میں پستی آجاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۱۰/۵۷)

"اور جو لوگ اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، انہیں سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کرتا اور سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے۔"

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ ۔ ۔ ۔ ۔

"اے رسول ان سے کہہ دیجئے کہ اس قسم کا ضابطۂ حیات، محض خدا کے فضل و کرم سے تمہیں مل گیا (ورنہ انسان کے بس کی بات ہی نہ تھی کہ اپنے کسب و ہنر اور اپنی عقل و فہم سے وہ ان حقائق کو معلوم کر لیتا)۔"

اس کے بعد، اُس فضل و رحمت عطا کرنے والے نے یہ حکم دیا کہ:۔

---

* یہ مقالہ وزارتِ مذہبی و اقلیتی امور پاکستان کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقالات بارہویں قومی سیرت کانفرنس

فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ..... "پس تمہیں چاہیئے کہ اس قدر گراں بہا نعمت اور بیش بہا عطیہ کے ملنے پر خوشیاں مناؤ ....." هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ (۱۰/۵۸)

"حقیقت یہ ہے کہ 'یہ نعمت'' دُنیا بھر کی نعمتوں کے مقابل میں جنہیں انسان جمع کرتا رہتا ہے، گرانقدر ہے۔ (یہ اس تمام علمی سرمایہ سے بہتر ہے۔ جسے نوعِ انسان آج تک جمع کر سکی ہے اور جو وراثتاً اس تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس کی مثل و نظیر، دُنیائے فکر و عمل میں کہیں نہیں مل سکتی)۔ لہٰذا تم اس قرآن کے ملنے پر خوشیاں مناؤ!"

اس سے واضح ہے کہ رمضان اور اس کی عید، درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے، جو تمام انسانیت کے لیے یکساں اور مشترک طور پر جشنِ مسرّت ہے۔ اس لیے کہ یہ "نعمت" کسی خاص قوم یا کسی خاص ملک کی ملکیت نہیں، یہ تمام نوعِ انسانی کی حیاتِ باشرف کا موجب اور امن و عافیت کی ضامن ہے۔

اصل یہ ہے کہ اقوامِ عالم نے ابھی سمجھا ہی نہیں کہ قرآن کیا ہے اور اس میں اقوامِ عالم کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں کیونکہ انہیں تو ہم مسلمانوں نے، جو وارثِ قرآن ہونیکا دعویٰ کرتے ہیں، یہ بتانا تھا کہ اس کی اقدار کے مطابق زندگی تشکیل دینے سے انسانیت کو کیا کچھ ملتا ہے۔ جب ہماری اپنی حالت، معاف فرمائیے، اسی ضابطۂ زندگی کو پسِ پشت ڈالنے سے، اپنی ہمعصر اقوام میں پست ترین ہے، تو اقوامِ عالم، یہ کیونکر جانیں کہ قرآن، انسان کو کن رفعتوں سے روشناس کرانے کیلئے نازل ہوا تھا۔ لیکن بہرحال جس دن انکی سمجھ میں یہ بات آگئی، جشنِ نزولِ قرآن سے بڑھ کر اور کوئی تقریب موجبِ مسرّت اور وجہِ نشاط نہیں سمجھی جائیگی۔ اس وقت ساری دنیا میں یہی ایک تقریب مشترک قرار پائے گی، "نزولِ قرآن اور عید میلاد النبیؐ کی تقریبِ سعید، جو اصل میں ایک ہی حقیقت کے دو گوشے (FACETS) ہیں"۔

قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے، اللہ کے متعیّن کردہ قانون کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ محیّر العقول کارگہِ ہستی، جس کے تصوّر سے ذہنِ انسانی ورطۂ حیرت میں ڈوب کر رہ جاتا ہے، اس حُسن و خوبی اور ربط و نظم سے چل رہا ہے کہ اس میں نہ کہیں کوئی سُقم ہے نہ خلل نہ فساد ہے نہ انتشار، نہ تزاحم ہے نہ تصادم، ہر شے اپنے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں انتہائی جذب و انہماک سے سرگرداں ہے اور اس سعی و عمل کا مجموعی نتیجہ، تعمیر و ارتقاء (CONSTRUCTION AND PROGRESS) کی شکل میں ہر آن سامنے آتا رہتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ

الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ○ (۶۷/۳) (الملک)

"(اگر تم دیکھنا چاہو کہ اس کا پروگرام کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اور اس کی صفاتِ رحمت و قدرت کس حسن و خوبی سے بیک زمان کارفرما ہیں، تو کائنات کی اس قدر عظیم مشینری پر غور کرو) اس نے فضا کی پہنائیوں میں، مختلف کرّوں کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں (ان میں باہمی تصادم نہیں ہوتا) ۔ تم یہاں سے وہاں تک دیکھ جاؤ، تمہیں خدائے رحمان کی تخلیق کردہ کائنات میں کہیں بے ترتیبی یا عدم مناسبت نظر نہیں آئے گی ۔ تم ایک بار نہیں، بار بار نگاہ کو لوٹا کر دیکھو، خوب جانچ پڑتال کر کے غور کرو، تمہیں کہیں کوئی دراڑ یا درز دکھائی نہیں دے گی۔ کوئی شے بے جوڑ یا اَن مل نہیں ہوگی ۔"

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ○ (۶۷/۴)

"تم طائرِ نگاہ کو فضا کی پہنائیوں میں بار بار اِذنِ بال کشائی دو اور اس سے کہو کہ وہ خوب اچھی طرح سے دیکھ لے کہ کائنات میں کہیں کوئی خلل، عیب یا ان کے باہمی ربط میں کوئی شگاف تو دکھائی نہیں دیتا ۔ وہ ہر بار، واماندہ و درماندہ کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گا اور اسے کہیں اختلال و فطور دکھائی نہیں دے گا ۔ (یہ ہے اس کائنات کا وہ نقشہ، جس میں صرف ہمارے قوانین کے مطابق، ہر شے سرگرمِ عمل ہے)"

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ اگر اس کائنات میں کسی اور کا حکم بھی چلتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۔ ۔ ۔ ۔ (۲۱/۲۲)

"اگر ارض و سمٰوٰت میں کوئی اور صاحبِ اقتدار بھی ہوتا تو ان میں ہر طرف فساد ہی فساد ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔"

حاضرینِ کرام! قرآن یہ کہتا ہے کہ اسی قسم کے غیر متبدّل قوانین، جنہیں عام طور پر مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے، انسانی زندگی کے لئے بھی مقرّر ہیں ۔ اگر انسانی معاشرہ ان قوانین کے مطابق چلے، تو اس کا نتیجہ بھی، خارجی کائنات کی طرح ہمیشہ تعمیری اور ارتقائی ہوگا ۔ اگر ان کے خلاف چلے گا تو تخریب اور فساد کے جہنّم میں جا گرے گا ۔ جس طرح ہم آج پاکستان میں، تخریب اور فساد کے جہنّم میں سراپا جھلس رہے ہیں ۔ ارشادِ خداوندی ہے :-

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ○ (۱۷/۹) (بنی اسرآءیل)

"یہ قرآن، بلاشبہ، کاروانِ انسانیت کو، سفرِ زندگی میں وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ توازن بدوش اور سیدھی ہے اور اُن لوگوں کو جو اِس کی صداقتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کے متعین کردہ پروگرام پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں، خوشخبری دیتا ہے کہ انہیں ان کے حسنِ عمل کا بہت بڑا اجر ملے گا۔"

اس قسم کی حیاتِ انسانیہ کے لئے، قرآنِ کریم جو فلسفۂ زندگی عطا کرتا ہے، اس کے نمایاں خط و خال یہ ہیں:

۱۔ انسان کی زندگی محض طبعی زندگی نہیں۔ انسان، جسم کے علاوہ ایک اور شے سے بھی عبارت ہے، جسے اس کی ذات کہا جاتا ہے۔

۲۔ مقصدِ زندگی، جسم کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ، ذات کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی ہے۔ اگر ان دونوں میں ٹکراؤ نہ ہو تو ہو المراد۔ لیکن اگر ان میں کسی وقت ٹکراؤ ہو جائے (TIE پڑ جائے) تو پھر ذات کے تقاضوں کو جسم کے تقاضوں پر ترجیح دی جائے گی کیونکہ جسم کی پرورش ایک ادنیٰ قدر ہے، جو ذریعہ ہے اس سے اعلیٰ قدر کی نمو کے حصول کا اور وہ ہے ذات کی نشوونما۔ اور جب بھی ادنیٰ اور اعلیٰ قدروں میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے، تو ہر ذی ہوش انسان، ادنیٰ قدر کو قربان کر کے، اعلیٰ قدر کو بچائے گا۔ ہمارے ہاں کا ایک مشہور مقولہ اس اصول کی بڑی خوبصورتی سے وضاحت کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔

"مال صدقہ جان، جان صدقہ آبرو"

یعنی جان اور مال میں سے ایک چیز بچ سکتی ہو تو مال کو قربان کر کے جان کو بچا لو۔ لیکن جب اس جان میں، جسے مال قربان کر کے بچایا گیا تھا اور آبرو میں سے ایک ہی کو بچانا ممکن ہو تو پھر یہی "جان" "ادنیٰ قدر" جائے گی اور اسے قربان کر کے اس سے اعلیٰ قدر "آبرو" کو بچایا جائے گا۔

۳۔ ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے، اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ، جسم کی موت کے بعد زندہ رہ کر آگے بڑھتی اور مزید ارتقائی مراحل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۴۔ جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ خود استعمال کریں۔ مثلاً آپ کے جسم کی پرورش صرف اسی خوراک سے ہوتی ہے، جسے آپ خود کھائیں۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس شے سے ہوتی ہے، جسے آپ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیں۔ بالفاظِ دیگر، جسم کی پرورش "لینے" سے ہوتی ہے اور ذات کی نشوونما "دینے" سے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں:۔

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ۝ (۹۲/۱۸) (اللیل)

"جو اپنا مال (دوسروں کو) دیتا ہے، اس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے۔"

یہ ہے وہ فلسفۂ زندگی، جس کی بنیادوں پر قرآنِ کریم اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ اِس معاشی نظام کے اصولی خط و خال یوں ہیں :-

۱۔ اللہ تعالےٰ نے سامانِ زیست، تمام انسانوں کی پرورش کے لئے بلا مُزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس لیئے ذرائع پیداوار پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا، حتیٰ کہ مملکت کا بھی نہیں۔ اجتماعی نظام کی خاطر یہ ذرائع مملکت کی تحویل میں تو رہیں گے۔ لیکن اس کی ملکیت قرار نہیں پائیں گے اور چونکہ رزق کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ زمین (الارض) ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے فرمادیا کہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ (۷/۱۲۸) اور ہم ہی اس زمین کے مالک ہیں۔ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ (۱۹/۴۰) اِسے ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰) اور اِس لئے یہ تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر رہنی چاہیئے، سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۴۱/۱۰ نہ صرف زمین بلکہ تمام عناصرِ طبعی جن کے امتزاج و تعاون سے زمین سے رزق پیدا ہوتا ہے۔ ان سب کے متعلق فرمایا کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ہیں ۵۶/۷۳ بھوکوں کے لئے سامانِ زیست ہیں لہٰذا اِن پر کسی اور کی ملکیت تسلیم کرنا، اللہ کے مقابلہ میں دوسرے خدا کھڑے کر دینے کے مترادف ہے۔ اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنا دینا ہے (۲/۲۲)۔

۲۔ چونکہ اصلِ حیات، انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ اور وہ اِس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان دوسروں کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ دے، اس لئے اس نظام میں ہر فرد کی خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت سے کمائے اور اپنی کمائی کے ماحصل میں سے، اپنی بنیادی ضروریات پورا کرنے کے بعد، باقی سب دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے تاکہ اس کی اپنی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو جائے۔ اس عمل (PROCESS) کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ کا ثواب اتنا ہی مفہوم رہ گیا ہے کہ سرمایہ دار جس قدر جی چاہے، سمیٹتے چلے جائیں لیکن اس میں سے اڑھائی فی صد خیرات کر دیں لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے، اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں "نشوونما" اور "ایتائے زکوٰۃ" کے معنی ہیں دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ یہ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ ارشادِ ربّ العالمین ہے :-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○ (سورۃ الحج (۲۲) آیہ ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انہیں ملک میں حکومت عطا کرتے ہیں تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں (تاکہ لوگ اللہ کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جائیں) اور نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ اُن احکام کو نافذ کرتے ہیں جنہیں، قانونِ خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے اور تمام

ایسے کاموں سے روکتے ہیں جنہیں وہ جائز قرار نہیں دیتا۔ غرضیکہ (یہ ہر پیش آمدہ معاملہ کے متعلق دیکھتے ہیں کہ اس باب میں اللہ کا قانون کیا کہتا ہے اس طرح ان کی حکومت میں باہمی مشاورت کے بعد بالآخر) ہر فیصلہ کا معاملہ اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔"

الصّلوٰۃ کے متعلق ضمناً" یہ عرض کرتا چلوں کہ "العدل والاحسان" کی طرح یہ بھی قرآنِ کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے ایسے معاشرتی نظام کا قیام جس میں ہر فردِ معاشرہ، اللہ کے قوانین کے پیچھے پیچھے اس انداز میں چلتا جائے کہ اس میں اور اللہ کے قوانین میں فاصلہ (دُوری) بھی نہ ہونے پائے اور یہ ان قوانین سے آگے بھی نہ نکل جائے۔ وہ نماز جو ہم ہر روز پڑھتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے اقامتِ صلوٰۃ ہو گئی، دراصل اِس نظام کا ضروری جزو اور فریضۂ خداوندی ہے جسے مقررّہ اوقات پر ادا کیا جاتا ہے اور محسوس مظہر ہے، اس اصولی تنظیم اور اس کے قوانین کے اتباع کا۔ ارشاد باری تعالےٰ ہے :-

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳)

اب میں پھر اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

جس معاشرہ کا ذکر کیا جا رہا ہے، اس میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیئے چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ اگر موقع آ پڑے تو وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا ہے۔ سورۃ الحشر ۵۹ میں ارشاد ہے :-

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ ۝ (آیہ ۹)

"یہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ اس سے انہیں خود تنگی ہی سے گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے"

وہ یہ کچھ کسی خارجی دباؤ یا سیاسی مصلحت کے ماتحت نہیں کرتا بلکہ یہ، اُس کی اپنی ذات کی نشوونما کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس میں وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ دیکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ کا جذبۂ محرّکہ (یعنی زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیئے جانے کا جذبۂ محرّکہ) حیاتِ آخرت پر ایمان کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا :-

اَلَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَہُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ہُمْ کٰفِرُوْنَ ۝ (حٰمٓ سجدۃ ۴۱/۷)

(جو لوگ اللہ کی تجویز کردہ راہ کو چھوڑ کر اور راہیں اختیار کرتے ہیں، اُن کی عملاً کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ سب کچھ اپنے لئے ہی سمیٹتے چلے جاتے ہیں اور) نوعِ انسانی کی نشوونما کی فکر نہیں کرتے۔ وہ درحقیقت، مستقبل کی زندگی (حیاتِ اُخروی) سے انکار کرتے ہیں۔

یہ صرف اِسی تصوّرِ حیات (حیاتِ آخرت پر ایمان) کے ماتحت ممکن ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اپنی ضروریات سے زائد، سب کچھ دُوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے اور دوسروں سے مُراد، صرف اپنی جماعت کے افراد ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسانی ہے کیونکہ اللہ تو ربّ النّاس بلکہ ربّ العالمین ہے۔

جب اپنی ضروریات سے زائد، سب کچھ دوسروں کے لئے دے دیا جائے گا، تو فاضل دولت (SURPLUS MONEY) جو تمام برائیوں کی جڑ ہے اور نظامِ سرمایہ داری کی بُنیاد، کسی کے پاس نہیں رہے گی۔ سو نہ تو جائدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوگا اور نہ ہی روپیہ سمیٹنے کی باہمی دوڑ۔ اس میں جو منافست (RACE) ہوگی وہ زیادہ سے زیادہ کما کر، زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دینے کے لئے ہوگی:۔

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ○ (۸۳/۲۶) (التطفیف)

یہ ہے وہ فلسفۂ زندگی اور اُس پر اُستوار ہونے والے معاشی نظام کی ایک جھلک جو جب اس دنیا میں قائم ہوتا ہے تو یہ زمین اپنے پرورش دینے والے کے نُور سے جگمگا اٹھتی ہے:۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) (الزمر)

اِس معاشی نظام کے دو بُنیادی ستون ہیں۔ 'العدل' اور 'الاحسان'، جو ہماری پیشِ نظر آیۂ جلیلہ کا مضمون ہیں۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○

"اللہ بلاشبہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم ہر ایک سے عدل کرو اور جس میں کوئی کمی رہ جائے، اس کمی کو پورا کرو۔ اس عدل و احسان کی ابتداء ذی القربیٰ (اپنے قریبیوں، اہلِ خاندان) سے کرو (اور پھر اس کا سلسلہ عالمگیر کرتے چلے جاؤ) بُخل سے بچو، یعنی یہ نہ کرو کہ سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر بیٹھ جاؤ۔ خدا نے تمہارے لئے جو حدود مقرّر کی ہیں، ان سے کبھی تجاوز نہ کرو، کسی حالت میں بھی قانون شکنی نہ کرو۔

یہ اَخلاقی اَقدار اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ تم انسانی زندگی کے بُلند مقاصد کو ہمیشہ سامنے رکھو اور زندگی کو محض طبیعی (حیوانی) نہ سمجھ لو۔"

عدل کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے برابر اس کا معاوضہ دینا۔ مثلاً قرآن کریم کہتا ہے کہ:۔ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (۵/۹۵) "یا اس کے برابر روزے رکھنا"۔ لہٰذا اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ کے معنی ہوئے کہ اللہ تعالےٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ہر فردِ معاشرہ کو اس کی محنت کا پُورا پُورا معاوضہ دو، اس میں کسی قسم کی کمی نہ کرو

لیکن جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ اوّلاً کسبِ رزق کی صلاحیتیں تمام انسانوں میں یکساں نہیں ہوتیں اور ثانیاً، کسی حادثہ، بیماری یا ضعیف العمری کی وجہ سے ایک انسان کی ان صلاحیتوں میں کمی بھی آسکتی ہے جس کی بنا پر وہ اپنی محنت سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اب اگر معاشرہ میں، اصول صرف محنت کے برابر دینے کا ہی ہو تو ایسے اشخاص اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی میں سے بعض سے محروم رہ جائیں گے۔ اور یہ چیز معاشرہ میں ایسی ناہمواری کا باعث بنے گی جس کی سزا سارے معاشرہ کو ملتی ہے۔ یہاں سے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث شریف بیان کیے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہتا جو ہیرے کی طرح جگمگا رہی ہے اور جو معاشرہ کی اس ذمہ داری کو نہایت خوبصورت اور مؤثر انداز میں بیان فرماتی ہے۔ جوں جوں انسان اس پر غور کرتا ہے، وجد میں آتا جاتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ :-

"اگر کسی شخص نے، کسی بستی میں، صبح یوں کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ اُٹھ گیا۔" (مسند امام احمدؒ)

ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کچھ اور بھی کرنا پڑے گا۔ اس کچھ اور کی تشریح اسی آیہ کا اگلا ٹکڑا کرتا ہے جس میں ہے کہ اللہ تمہیں عدل کے ساتھ ساتھ احسان کا بھی حکم دیتا ہے اور یہ ہے قرآن کے معاشی نظام کا دوسرا بنیادی ستون! "الاحسان"۔

احسان کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی زندگی کا توازن، کسی وجہ سے بھی بگڑ گیا ہے تو، اس کی اس کمی کو، جو اس توازن کو بگاڑنے کا سبب ہے، اپنے پاس سے دے کر پورا کرو اور اس طرح اس حسن (یعنی توازن) کو لوٹا دو، دوبارہ قائم کر دو۔ اس کے لیے حکم دیا کہ ایسے بگڑے ہوئے توازن کی درستگی اپنا ذی القربیٰ سے شروع کرو۔ ہمارے ہاں ذی القربیٰ سے عام طور پر قرابت دار، قریبی رشتہ دار مراد لیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک مطلب اور بھی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (۱۷/۲۶) جو شخص جس چیز یا تے کے قریب ہو، اس کو وہ حق دیا جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ یعنی جب دو تو دیکھو کہ ضروریات کے لحاظ سے کون اقرب ہے، کس کی ضروریات سب سے پہلے پوری ہونی چاہیئے۔ تمہارے اپنائے زکوٰۃ سے مستفید ہونے والوں میں سے کون سب سے زیادہ (BEFITTING) حقدار ہے۔

اور چونکہ یہ سب کچھ ایک معاشرتی نظام کے تحت ہی ممکن ہے اور معاشرہ میں ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں، اس لیے العدل اور الاحسان کے مثبت احکام کے ساتھ ساتھ الفحشاء اور المنکر سے رکنے کا حکم بھی دیا گیا۔ الفحشاء کے تحت ایک تو ہر قسم کی برائی اور بے حیائی آتی ہے جس سے بچنا ضروری ہے، دوسرے اس کے معنی سخت بخیلی اور بخل کے بھی آتے ہیں۔ فحشاء کو عدل کے مقابل لاکر کہا گیا ہے کہ تم ایسا نہ کرو کہ حدود شکنی کر کے ادائے

حق میں بخل کرو اور حقدار کا حق روک لو، اس میں ڈنڈی مار لو۔

اسی طرح المنکر کے ایک عام معنی تو یہی ہیں کہ ہر وہ فعل جو قانونِ خداوندی کے مطابق ناپسندیدہ ہو تاہم اس کے معنی ہوتے ہیں عقل فریب کار کی حیلہ جوئیاں، جو انسان کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے پر اکساتی رہتی ہیں۔ لہٰذا خالقِ بشر نے، جو اس کی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہے، العدل اور الاحسان کے ساتھ ساتھ الفحشاء و المنکر سے بچنے کا حکم دیا اور یہ بات اس طرح سمجھا دی کہ تم الاحسان پر عمل کرو تو اس کے لئے کسی اضافی جزا یا معاوضہ کا خیال تک دل میں نہ لاؤ کیونکہ :۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵/۶۰) یعنی تم نے جو احسان کیا اور بگڑے ہوئے توازن (حسن) کو واپس لوٹانے کے لئے کوشش کیں اور اس کے لئے اپنی محنتوں کے ماحصل کو صرف کیا تو اس کا بدلہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بگڑا ہوا توازن (حسن) درست ہو جائے۔ لہٰذا تمہاری کوششوں کا نتیجہ اس توازن کی درستگی میں تمہیں مل گیا، اب اور کس معاوضے کے تم طلب گار ہو سکتے ہو۔؟

حاضرینِ گرامی! یہاں قرآنِ حکیم ہماری توجہ ایک اور نکتے کی طرف مبذول کراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام کا قیام، جماعتِ مومنین کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے۔ یعنی ان لوگوں کے ہاتھوں، جن کا قرآنِ کریم کے فلسفۂ زندگی پر ایمان دل کی گہرائیوں سے اٹھتا ہے اس لئے وہ نہ صرف یہ کہ اپنی ان حسن کارانہ کوششوں کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے :۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) بلکہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہارے شکر گذار ہیں کہ تمہارے اندر پیدا ہونے والی ان کمیوں نے ہمیں موقع فراہم کیا کہ تمہارا توازن لوٹانے میں، ہم نے اپنی ذات کی بالیدگی کا سامان پا لیا۔ کتنا حسین ہو گا وہ معاشرہ جس کے افراد کا مقصودِ زندگی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ کمائیں اور اپنی محنتوں کے ماحصل کو دوسروں کے بگڑے ہوئے توازن درست کرنے کے لئے یہ کہتے ہوئے خرچ کریں کہ ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ ہم تمہارے شکر گذار ہیں۔ تصوّر میں لایئے ایسے معاشرے کے افراد کی بلندئ درِفعتِ کردار!

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اَلْبَغْیِ سے منع فرمایا یعنی خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے سے، کیونکہ حدود مقرر ہی اس لئے کیے جاتے ہیں کہ ان کے اندر رہتے ہوئے، کاروبارِ حیاتِ انسانی، دریا کی ساحلوں کے اندر روانیوں کی طرح بلا روک ٹوک، مست خرامیوں سے چلتا رہے اور انسانی زیست اپنی امکانی وسعتوں کو پا لے۔ اس نے ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا کہ تمہیں اقدارِ قرآنی کے ساحلوں میں پابند کرنے سے ہمارا اپنا کوئی مفاد پیشِ نظر نہیں بلکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) اللہ انسان پر جو پابندیاں بھی عائد کرتا ہے تو وہ اس لئے ہوتی ہیں کہ ان سے اس کی ذات میں وسعت اور کشاد پیدا ہو۔

(THE WHY OF THEM) یہ تمام احکام دینے کے بعد اس قادرِ مطلق نے، اپنی سنّت کے مطابق، ان احکام کی حکمت

یہ کہہ کر بیان فرمادی کہ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ کہ یہ اقدار تمہیں اسلئے عطا کی گئیں ہیں کہ تم انسانی زندگی کے بلند مقاصد کو ہمیشہ سامنے رکھو اور اس طرح تم حیاتِ انسانیہ کے اس شرف و مجد کو پالو، جو ہم نے تمہارے لئے مقدّر کر رکھا ہے اور اپنی زندگی کو کھانے پینے، افزائشِ نسل اور مرجانے تک (یعنی حیوانی سطح تک) ہی نہ سمجھ لو۔ کیونکہ ہم نے انسان کو بڑا ہی واجب التکریم بنایا ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) اور اس سے مُراد تمام بنی آدم ہیں۔ اس کے بعد فلاح و کامیابی اور نجات و سعادت کا آخری معیار یہ کہہ کر انسان کے سامنے رکھ دیا کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) یاد رکھو بقا صرف اس نظامِ حیات اور فعلِ انسانی کو حاصل ہوگی جس میں تمام بنی نوعِ انسانی کی منفعت ہو!

حاضرینِ گرامی! یہاں تک میں نے عدل اور احسان کے صرف معاشی گوشے سے متعلق گفتگو کی ہے۔ لیکن عدل کے معنی اس سے وسیع تر ہیں جو زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہیں۔ سورۃ شوریٰ میں ہے:۔ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (۴۲/۱۵) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تم میں عدل کروں اور اس عدل کے متعلق حضور نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے:۔

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ..... (۴/۵۸)

"جب تم لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات میں فیصلہ دو تو ایسا ہمیشہ عدل کے مطابق کرو"

ظاہر ہے کہ متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے، عدالت کے علاوہ، مدّعی، مدّعا علیہ اور گواہ بھی ضروری ہوں گے۔ اس باب میں جو جامع احکام قرآنِ کریم نے دیئے ہیں، اُن سے نظامِ عدل کا پورا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ فرمایا:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝ (۴/۱۳۵) النسآء

اے جماعتِ مومنین! تم قیامِ عدل کے ذمّہ دار بن کر رہو۔ کسی معاملہ میں شہادت دینی ہو تو مدّعی کی طرف سے گواہ بن کر آؤ، نہ مدّعا علیہ کی طرف سے۔ تم اللہ کی طرف سے گواہی دینے کے لئے آؤ۔ بات سچی کہو، خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ چلی جائے۔ تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین کے خلاف یا تمہارے رشتہ داروں کے خلاف۔ یہ مت دیکھو کہ فریقین میں کون امیر ہے، کون غریب۔ تم اللہ کی طرف سے گواہ بن کر آئے ہو، تم ان کی پوزیشن کا خیال مت کرو۔ اللہ کا قانون خود دیکھ لے گا کہ فیصلہ کس کے حق میں جانا چاہیئے۔ بڑے محتاط رہو کہ کہیں تمہارے جذبات، حق گوئی کے راستہ

... حائل نہ ہو جائیں۔ جب بات کرو، صاف صاف کرو، واضح دو ٹوک کرو۔ نہ توڑ مروڑ کر بات کرو ورنہ ہی سچی گواہی دینے سے اعراض برتو۔ یاد رکھو! تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہوتا ہے۔

یہ تو پھر بھی اپنوں کی بات تھی۔ قرآنِ کریم اس باب میں ایک قدم اور آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭاِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ المائدہ (۵/۸)

"کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اُن سے عدل نہ کرو۔ ہر ایک سے عدل کرو، ہر حال میں عدل کرو۔ یہ روش تمہیں اس معیارِ زندگی کے نزدیک تر لے آئے گی جس تک اللہ تمہیں لانا چاہتا ہے۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔"

لیکن عدل کے معاملہ میں ایک بنیادی نقطہ سمجھنے کے قابل ہے۔ دنیا کے عام معیار کے مطابق، عدل سے مراد ہے مروّجہ قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا۔ یعنی اگر معاملہ کا فیصلہ رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو اسے مبنی بر عدل کہا جائے گا، اگر فیصلہ اس قانون کے خلاف ہو تو اسے بے انصافی یا دھاندلی سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلہ ہی کو عدل کہا جانا چاہیئے لیکن قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ اگر خود وہ قانون ہی ظلم پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ، مبنی بر عدل کس طرح کہلا سکے گا۔ لہٰذا قوانین بھی عدل پر مبنی ہونے چاہئیں۔ لیکن انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے متعلق تو اس امر کی ضمانت کبھی نہیں دی جا سکتی کہ ان میں شعوری یا غیر شعوری طور پر واضعین قوانین کے جذبات کی آمیزش نہیں ہوئی۔ انسان مشین نہیں کہ اس میں جو کچھ ڈالا جائے وہ اپنے رجحانات کی آمیزش کے بغیر اسے اسی طرح آگے گذار دے۔ وہ اپنے سینے میں دھڑکتا ہوا دل رکھتا ہے۔ جو بات اس کے دل میں سے ہو کر گذرے گی اس میں، اس کی رنگینی کے شائبہ کی آمیزش کا امکان ہوگا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جذبات سے بلند و بالا صرف خدا کی ذات ہے اور اسی کی طرف سے دیئے گئے قوانین کے متعلق حتم و یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان میں قانون وضع کرنے والے کے جذبات کی آمیزش نہیں۔ اس نے وحی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ (النجم) (۵۳/۳-۴)۔ یہ قرآن وحیٔ خداوندی ہے۔ اس میں صاحبِ وحی کے اپنے خیالات و جذبات کی آمیزش قطعاً نہیں۔

لہٰذا، قرآنِ کریم کی رُو سے 'عدل' سے مُراد ہو گا وہ فیصلہ، جو وحی پر مبنی قوانین و اقدار کے مطابق کیا جائے۔ اسی طرح فیصلہ کرنے والوں کے متعلق کہا کہ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۷/۱۸۱) یہ وہ لوگ ہیں جو الحق وحیٔ خداوندی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ کفر اور ایمان کا معیار ہی قرآنِ کریم یہ بتاتا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ المآئدہ (۵/۴۴) "جو لوگ اللہ کی طرف سے نازل کردہ (وحی) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، تو یہی لوگ تو کافر ہیں"۔ دوسرے مقامات پر انہیں الفاسقون (یعنی اپنے قالبِ زندگی سے باہر نکل جانے والے) اور الظالمون (یعنی ہر چیز کو اس کے صحیح اور متعیّنہ مقام پر نہ رکھنے والے) کہا گیا ہے۔

قانونِ ربّانی اور انسانی جذبات میں کس طرح فرق کیا جاتا ہے۔ اس کی درخشندہ مثال ہمیں سیرتِ نبوی علیہ التحیہ والسلام میں ملتی ہے۔ "بنی مخزوم کے ایک نہایت معزز خاندان کی ایک عورت نے چوری کی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اُسے سزا دی جائے۔ اس قوم میں اس سے بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ سب نے اسامہؓ بن زیدؓ کو آمادہ کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کردیں کہ اسے سزا نہ دی جائے۔ جب حضرت اسامہؓ نے اس باب میں حضورؐ سے گفتگو کی تو آپؐ کا چہرۂ مبارک غصّہ سے لال ہوگیا اور فرمایا کہ اے اسامہؓ! تو حدود اللہ کے خلاف سفارش کرتا ہے؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے! اگر فاطمہؓ بنتِ محمدؐ بھی چوری کرتی تو ہم اُسے بھی سزا دیتے۔ یہ اس لئے کہ قرآن میں ہے: وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ ۲۴ (النور) "اور مجرمین کے معاملہ میں قانونِ خداوندی کے مطابق سزا دہی میں شمّہ برابر نرمی نہ برتی جائے"۔

(بحوالہ معراجِ انسانیت صہ ۳۵۴)

اسی طرح، قانون نافذ کرنے والی اور ذاتی حیثیت میں کس طرح فرق کیا جاتا ہے۔ اس کا سبق بھی ہمیں اسی ذاتِ اقدس و اعظم کی سیرتِ طیبہ سے ملتا ہے۔ حضورؐ نے ایک یہودی کو جرمِ قتل کی سزا میں موت کا حکم سنایا۔ جلاّد اس کے سر پر تلوار لئے کھڑا، آخری اشارے کا منتظر تھا کہ اتنے میں اس یہودی کی خوردسالہ بچّی روتی، چیختی چلاتی، دوڑی دوڑی آئی اور حضورؐ کی ٹانگوں سے ساتھ لپٹ کر التجا کی کہ مجھے یتیم ہونے سے بچا لیجئے۔ اس کی آہ وفغاں اس قدر دردآلود تھی کہ حضورؐ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ صحابہؓ نے سمجھا کہ حضورؐ قتل کا حکم واپس لے لیں گے۔ لیکن آپؐ نے بچّی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جلاّد کو قتل کا اشارہ دے دیا۔ بعد میں صحابہؓ کے دریافت کرنے پر حضورؐ نے جو فقرہ ارشاد فرمایا وہ جذبات اور عدل کی کش مکش میں ابدی راہ نمائی کا حکم رکھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت "محمد ابنِ عبداللہ" کی آنکھ رو رہی تھی اور "محمدؐ رسول اللہ" کا ہاتھ اللہ کا حکم نافذ کر رہا تھا۔

محمد ابنِ عبداللہ (معاشرے کے ایک فرد) اور محمدؐ رسول اللہ (اللہ کا قانون نافذ کرنے والی ذاتِ گرامیؐ) میں فرق ملحوظ رکھنا ہر شخص کا کام نہیں، اس کے لئے بڑی پختہ سیرت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی ہے وہ فرق جس سے، باوصفِ اطاعت وانقیاد، متبعین کے جوہرِ خودی کی پرورش اور جذباتِ حرّیت کی تربیت ہوتی ہے۔

یہ ہے حاضرین گرامی! اسلام کے نظامِ عدل و احسان کا وہ نقشہ جو میں، قرآنِ کریم سے سمجھ پایا ہوں اور یہی ہے وہ نظام، جو حضور نبی اکرمؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں قائم فرمایا اور لوگوں کو دکھلا دیا کہ دین سے یہ مفہوم ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کے بعد یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اقبالؒ کے الفاظ میں عجمی سازشوں سے اس میں خرابیاں آنی شروع ہو گئیں اور رفتہ رفتہ خلافت، ملوکیت میں بدل گئی، یعنی اللہ کی حکومت و اطاعت کی جگہ پھر سے انسانوں کی حکومت قائم ہو گئی، جو اب تک اسلامی ممالک میں جاری ہے۔ اسے پھر سے اللہ کے تختِ اجلال سے بدلا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ ایسا ممکن ہے اور یقیناً ممکن:۔

"بشرطیکہ، اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ، جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے، رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:۔

حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ!

ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے!"

"خطباتِ اقبالؒ" (انگریزی ایڈیشن فروری ۱۹۷۱ء
مطبوعہ شیخ محمد اشرف۔ صـ ۱۶۲)"

دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس کے حصہ میں آتی ہے:۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا!

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

طلوعِ اسلام کا آئندہ شمارہ جنوری فروری ۱۹۸۹ء کا مشترکہ پرچہ ہو گا۔ اور کنونشن نمبر ہو گا۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات کے دوران سامنے آنیوالا

ایک اشتہاری پرچہ

بانیٔ پاکستان حضرت قائدِاعظم محمد علی جناحؒ، تحریکِ پاکستان کے دوران مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ، انتخابات اور مہاجرین کے بارے میں جماعتِ اسلامی کے بانی (مولانا) مودودی مرحوم کی

گوہرافشانیاں

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی کے ارشادات

○ پاکستان کا قیام اور اس کی پیدائش ورندرے کے برابر ہے
(ترجمان القرآن جلد نمبر ۳۱ صفحہ نمبر ۵۱ اشاعت ۴۸ء پاکستان)

○ محمد علی جناح کا مقام مسندِ پیشوائی نہیں بلکہ بحیثیت غدّار عدالت کا کٹہرا ہے۔" (ترجمان القرآن جلد نمبر ۳۱ صفحہ ۶۲ اشاعت ۱۹۴۸ء)

○ "تقسیم ہند کے تین اداکار تھے اور محمد علی جناح کی اداکاری سب سے زیادہ ناکام رہی۔"
(ترجمان القرآن جلد نمبر ۳۱ صفحہ ۷۰ اشاعت ۱۹۴۸ء)

○ "مسلم لیگ کو ووٹ دینا حرام ہے۔"
(ترجمان القرآن جلد نمبر ۲۸ صفحہ ۱۲۵ اشاعت پٹھان کوٹ)

○ محمد علی جناح جنت الحمقاء (احمقوں کی جنت) کا بانی اور اصل فاجر (گنہگار انسان) ہے۔" (ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۵۳ء)

○ "پاکستان جنت الحمقاء اور مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہے۔"
(ترجمان القرآن ۱۹۴۶ء صفحہ ۱۵۲)

○ پاکستان لاکھوں کروڑوں ڈاکوؤں، لٹیروں، قاتلوں، زانیوں اور سخت کمینہ صفت ظالموں سے بھرا ہوا ہے۔"
(ترجمان القرآن جلد نمبر ۳۱ صفحہ ۵۹)

○ "انتخابی مہم شکاری کتوں کی دوڑ ہے۔"
(کوئٹہ ۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء)

○ مسلم لیگ خدا سے بے خوف اور اخلاق کی بندشوں سے آزاد جماعت ہے جس نے ہمارے اجتماعی ماحول کو بیت الخلاء سے بھی زیادہ گندا کر دیا۔"
(جماعتِ اسلامی کی انتخابی جدوجہد صفحہ ۱۶ شائع کردہ شعبہ نشر و اشاعت)

○ "مہاجر وہ بھگوڑے اور بزدل ہیں جنہوں نے قومیت کی جنگ لڑی اور جب سزا بھگتنے کی باری آئی تو راہِ فرار اختیار کر لی۔"
(بیان مولانا مودودی نوائے وقت ۲۹ اگست ۱۹۴۸ء)

تحقیق: این ایم فاضل
(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ۝

(سورۃ ۲ آیت ۱۵۲/۲)

"پس تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا اور تم میرا شکر کرتے رہو اور تم میرا انکار مت کرو۔"

قرآن پاک ایک الہامی کتاب ہے وہ نوع انسان کی ہدایت کے لئے نازل کی گئی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کو آسان پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے تاکہ سمجھنے والے کو آسانی رہے۔ اس میں کوئی کجی یا ٹیڑھا پن نہیں ہے کہ کسی کو سمجھنے میں دقت یا رکاوٹ ہو۔ (قرآن)

ہر علم، ہر نئی کتاب کے سمجھنے کے کچھ لوازم ہوتے ہیں۔ اس کیلئے بھی کچھ لوازم ہیں۔ جنکو مطالعہ کے وقت پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ قرآن کریم کے پہلے پارہ میں منافقین کا بیان ہے کہ "ہم تو ٹھٹھا کرنے والے ہیں"۔ قرآن کریم ان کے جواب میں کہتا ہے کہ "اللہ ان سے ٹھٹھا کرتا ہے"۔ بغیر کسی تمہید اور بحث کے یہ بات واضح ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی ذات باصفات ٹھٹھا سے بالاتر ہے۔ کیونکہ وہ خیر ہی خیر ہے۔ اس لئے "اللہ ٹھٹھا کرتا ہے" کے معنی ہوئے اللہ تعالیٰ ان کو ان کے ٹھٹھا کرنے کی سزا دیتا ہے (۱)

قرآن پاک میں ایک جگہ ہے کہ "وہ مکر کرتے ہیں اور اللہ بھی مکر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بہترین مکر کرنے والا ہے۔"

اللہ سبحانہٗ کی ذات باصفات مکر سے بالاتر ہے کیونکہ وہ خیر ہی خیر ہے تو معنی یہ ہوئے "وہ مکر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے مکر کی سزا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مکر کرنے والوں کو بہترین سزا دینے والا ہے کیونکہ اس کا قانون مکافات عمل کائنات کو محیط ہے۔" (۲)

قرآن پاک کی ان دو واضح مثالوں کے بعد مذکورہ آیت پر غور کریں اور ترجمہ کریں "تم میرے ذکر کو یاد رکھو۔ میں بھی تمہارے ذکر کو یاد رکھوں گا اور تم میرا شکر ادا کرتے رہو اور میرا انکار کرنے والے مت بنو"

اس کا صاف واضح سیدھا مفہوم یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبہ میں اور سفر حیات کے ہر موڑ پر خدا کے قانون (ذکر) کو سامنے رکھے اور اس کے مطابق چلے۔ خدا کے احکام و ضوابط کو ہر وقت سامنے

رکھے؟ انہیں کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے۔

اب مذکورہ آیت کا صاف اور واضح مفہوم یہ ہوا کہ "اے میرے قانون (قرآن) کو ماننے والو، تم میرے قانون (قرآن) کے مطابق عمل کرتے رہو اور میں اپنی رحمت، راحت، نعمت سے نوازتا رہوں گا"

بالفاظ دیگر تم میرے قانون کی پابندی کرو، میں اس پابندی کی جزا تم کو دیتا رہوں گا۔ اس صورت میں جبکہ خدا کی نعمت، رحمت، راحت، تمکو ڈھانپ لے تو مغرور و سرکش نہ ہو جانا کہ قانون کی پابندی چھوڑ دو اور راندۂ درگاہ الٰہی ہو جاؤ کہ اس کا قانون مکافات عمل ساری کائنات کو محیط ہے۔

قانون (ذکر) کی پابندی کا نام ایمان ہے۔ اس کی عملی شکل اسلام ہے، جو سیادت و قیادت کا علمبردار ہے۔ اور اس کے ماننے والے دنیا میں امن و امان کے امین، عدل و انصاف کے محافظ، مظلوم و محروم کے پاسبان اور نگہبان ہیں۔ اسی لئے خدا کے قانون نے ان محافظوں پاسبانوں اور نگرانوں کو خیر امۃ کے لقب سے نوازا اور امن عالم کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس قانون کا متن اس پر گواہ اور شاہد ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۳ سال مکہ میں گزارے اور اپنی سابقہ زندگی کو بطور شہادت کے پیش کیا۔ منکرین اسلام آپ کو صادق اور الامین تسلیم کرتے تھے مگر آپ کی دعوت کے منکر تھے، یہاں تک کہ ہجرت ہوئی۔ مدنی زندگی میں ۱۰ سال کے اندر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جانثاروں کو چھوٹی بڑی ۸۴ مہمات (جنگیں) پیش آئیں۔ آپؐ نے اور آپؐ کے جانثاروں نے اس پر شدائد دس سال کی مدت میں قانون خدا کی ہر طرح پابندی کی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بے سروسامان لوگ، تہی دست، فاقہ مست، بھیڑ بکری چرانے والے شتربان دنیا کی دو سپر طاقتوں کو ہر میدان میں شکست دے کر کامیاب و کامران ہوئے اور تاریخ میں ایک ریکارڈ قائم کر گئے۔

جب سے اہل اسلام نے ذکر (قانون) کی پابندی کی بجائے ورد و ظیفہ کا زبانی کلامی سلسلہ اپنایا، دنیا کی ہر نعمت اور آسائش حاصل ہونے کے علی الرغم یروشلم، بنی اسرائیل سے آزاد نہ کرا سکے، کشمیر واپس نہ لے سکے، اپنی صفوں میں نظم و نسق قائم نہ کر سکے اور ہندی بھائیوں کی کوئی مدد نہ کر سکے اور اپنے اندر عدل و انصاف قائم نہ رکھ سکے تاکہ محرومی اور مظلومیت کا چارا و مداوا ہوتا تو اور کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

قانون کی (ذکر) پابندی۔ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

قانون سے اعراض۔ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا

فرق ظاہر ہے۔ کاش ہم غور کریں۔

دین الحق قاضی

محمد عمر دراز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شریعت کسے کہتے ہیں؟

کتب لغت اور قرآن کریم کے مطابق، لفظ شریعت کے مندرجہ ذیل معانی بیان ہوئے ہیں :۔

اَلشَّرِیْعَۃُ :۔ وہ گھاٹ جس پر آدمی اور جانور پانی پینے کے لیے آتے ہیں لیکن اس کے لیے خصوصیت یہ ہے کہ پانی مسلسل بہنے والے چشمے سے آرہا ہو، جو بند نہ ہوتا ہو۔ کھلا ہوا اور سطح زمین پر جاری ہو۔ یعنی اس سے پانی حاصل کرنے کے لیے کسی رسّی وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے۔ اگر بارش وغیرہ کا جمع شدہ پانی ہو، تو وہ شریعہ نہیں بلکہ کُرَعٌ کہلائے گا۔

اَلشَّارِعُ :۔ اس عام راستہ کو کہتے ہیں جس پر سب لوگ چلتے ہیں۔

اَلشِّرْعُ :۔ سیدھے راستہ کو کہتے ہیں جو واضح اور کھلا ہو۔ (لغات القرآن مادہ ش ر ع)

ہمارے ہاں 'شارع' اس راستہ کو کہتے ہیں جس پر سب چل سکتے ہوں۔ ایسا راستہ جو سب کے لیے نہ ہو بلکہ پرائیویٹ ہو اُسے کہتے ہیں کہ یہ شارع عام نہیں ہے۔ (NO THOROUGH-FARE)۔

الاعوانی نے کہا ہے کہ :۔

شَرَعَ :۔ کے معنی ظَھَرَ ہیں یعنی ظاہر ہو گیا، کھل گیا۔

اَلشِّرَاعُ :۔ کشتی کے بادبان کو کہتے ہیں۔

اَلشَّرِیْعَۃُ :۔ دروازے کی چوکھٹ کو بھی کہتے ہیں۔

اَلشَّرِیْعَۃُ وَالشِّرْعَۃُ :۔ سیدھا اور واضح راستہ (تاج و محیط) ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو طول کی جانب سے کھول دینا۔ یعنی اس طرح کھول دینا کہ وہ یہاں سے وہاں تک پوری کی پوری سامنے آجائے۔ (لغات القرآن مادہ ش ر ع)

شریعت :۔ دینی قانون، طریقہ، رستہ، ظاہر کی صفائی۔ بڑی نہر۔ پنگھٹ (گلزار معانی)

شریعت :۔ مذہبی احکام، خدا تک پہنچنے کا رستہ، خدا کا بتایا ہوا وہ رستہ جو پیغمبروں کے ذریعے انسانوں کو معلوم ہو۔ بڑی ندی، بڑی اور جاری نہر، پنگھٹ یعنی پانی کا کنارہ جہاں سے لوگ پانی لیتے ہیں۔

(فیروز اللغات فارسی)

شَارِعٌ :- طریق عام - مرور (المورد)
شَرَعَ :- کھلے راستے پر ہونا -
شَرِیعَۃٌ :- خدائی قانون - چوکھٹ - گھاٹ (فیروز اللغات عربی)
شریعت :- اسلامی قانون راہِ روشن (فرہنگِ عامرہ)
مذہبی قانون - طریقہ
شَرَعَ :- سیدھا راستہ، قانون محمدی جو قرآن کے مطابق ہے - (فیروز اللغات اردو)

سورۃ الشوریٰ میں ہے - شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ (۴۲/۱۳)
"خدا نے تمہارے لیے اس نظامِ زندگی (الدین) یا قانونِ حیات کو نمایاں اور واضح کر دیا ہے۔"

سورۃ جاثیہ میں ہے - ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ (۴۵/۱۸)
"پھر ہم نے تجھے 'الامر' (دین کے معاملہ) میں ایک کھلے اور واضح راستے پر لگا دیا۔"

سورۃ الشوریٰ میں ہے:-
أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۴۲/۲۱)

"کیا ان کے کچھ (خدائی) شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی اور اگر (خدا کی طرف سے) ایک قولِ فیصل (ٹھیرا ہوا) نہ ہوتا۔ تو دنیا میں ہی ان کا فیصلہ ہو جاتا، اور (آخرت میں) ان ظالموں کو ضرور دردناک عذاب ہو گا۔"

(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)

الشریعہ کے ان معانی کو سامنے لائیے اور پھر غور کیجیے کہ شریعت کی خصوصیات کیا ہیں - ان معانی کے لحاظ سے اَلشَّرِیعَۃُ (یعنی الدّین کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اسلامی معاشرہ کی مرتّب کردہ جزئیات) کو واضح، سیدھا اور نمایاں ہونا چاہیے۔

نیز ایسا راستہ جو ہر ایک کے لئے یکساں ہو - ایسا پانی جس سے سب سیراب ہو سکیں، جس تک سب کی رسائی ہو - جو مسلسل آ رہا ہو - بارش کا ایک جگہ جمع شدہ پانی نہ ہو، کنواں نہ ہو - لہٰذا شریعت وہ ہو گی جس میں جمود، تعطّل نہ ہو - جس میں تسلسل ہو - جو زمانے کے بہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے - اگر وہ جوئے رواں ہونے کی بجائے بند پانی کی طرح ہو گی تو اس میں کچھ عرصہ کے بعد فساد کی بو پیدا ہو جائے گی وہ زندگی بخش نہیں رہے گی - (لغات القرآن مادہ ش ر ع)

بقیہ برصفحہ ۱۰

بزمِ طلوعِ اسلام لندن کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی

یومِ پاکستان

کی تقریب کی روئداد

گذشتہ سال طلوعِ اسلام کی پہلی یورپی کنونشن کے حوصلہ افزا و مثبت اثرات کے نتیجہ میں اراکینِ بزم نے فیصلہ کیا کہ لندن میں ایک عام پبلک اجتماع کا انتظام کیا جائے۔ مثلاً یوم قائداعظمؒ یا یوم پاکستانؒ پہ لہٰذا گذشتہ سال اکتوبر میں ہی سنٹرل لندن میں اسی مشہور و معروف کانوے ہال کو یوم آزادیٔ پاکستان کی تقریب منانے کے سلسلے میں بک کروالیا تھا۔ مقامی ویکلی "اخبارِ وطن" میں اعلانِ جلسہ کا اشتہار دیا گیا۔

۲۱۔ اگست بروز اتوار شمعِ قرآنی کے پروانے ڈیڑھ بجے ہی ہال میں پہنچ چکے تھے اور بک سٹال پوسٹرز۔ تصاویر اور سٹیج مہمانوں کی آمد سے پہلے ہی آراستہ پیراستہ کر دی گئیں۔

دیگر بزموں کی نمائندگی، برمنگھم سے بیرسٹر میاں محمد اسلم، آکسفورڈ سے ایم۔ وائی علی، مڈلینڈ سے حنیف کلو، ناٹنگھم سے جلیل جعفری۔ لیڈز سے امجد حسین اور رفقاء۔ بریڈفورڈ سے رشید بٹ، کارڈف سے علی حسین خانصاحب SOUTHEND-ON-SEA سے راجہ اعظم صاحب اور محمود نے کی اور مقامی طور پر بھی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلّق رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی، یہ قرآن کی عظمت وابدیت اور صداقت اور محترم پرویزؒ صاحب کا مقناطیسی مدلّل اندازِ بیاں تھا کہ مہمان جوق در جوق تشریف لا رہے تھے۔ واضح اکثریت ان لوگوں کی تھی۔ جنہوں نے پرویزؒ صاحب کو پہلے نہ دیکھا نہ ہی کوئی درس سنا تھا۔

ٹھیک ۲½ بجے نمائندہ بزم مقبول محمود فرحت مائیک پر آئے اور مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے جلسہ کے آغاز کا اعلان کیا۔

سب سے پہلے بزم کے سرکردہ رکن جناب ریاض احمد صاحب کے برادرِ اصغر فیاض رضوی صاحب نے سورہ بقرہ کی چند آیات پُراثر انداز میں تلاوت کیں۔ بعد ازاں جناب ادیب صدیقی حیدر آبادی نے

پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ نے دیا اس مناسبت سے بالِ جبریل سے یہ غزل، دلنواز انداز اور ترنم سے محترمہ نصرت بخاری صاحبہ نے سنائی۔

میرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ!

اس کے بعد جناب محمد بشیر صاحب نے پرویزؒ صاحب کا تعارف پیشِ سامعین کیا، انہوں نے پرویزؒ صاحب کی ابتدائی زندگی، تحریکِ پاکستان میں عملی حصّہ۔ قائداعظمؒ کے ساتھ قرآنی رفاقت اور قرآن مجید پر ان کے تفکّر اور گراں مایہ تصانیف پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ اگر پرویزؒ صاحب جیسا مفکّر مغرب میں پیدا ہوتا تو قومیں انہیں سر آنکھوں پر بٹھا لیتیں اور اپنے ذرائع ابلاغ سے انہیں چار دانگِ عالم میں شہرت یافتہ بنا دیتیں۔

بعد ازاں مقبول محمود فرحت نے بزم لندن کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد پرویزؒ صاحب کا خصوصی خطاب "یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر کہ یہ وہ سحر تو نہیں" ٹی وی پر سامنے آیا۔ پونے دو گھنٹہ کی تقریر اور وہ بھی ویڈیو پر، سامعین کی توجّہ کو اپنی طرف مرکوز رکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے مگر کیا مجال کہ اس دوران کسی نے بھی عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہو۔

اس سحر انگیز خطاب کے بعد چائے وغیرہ کے لئے وقفہ تھا۔ جس کے دوران تازہ دم ہو کر سامعین پھر اپنی اپنی سیٹوں پر آ پہنچے۔ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ چونکہ پرویزؒ صاحب مفکّرِ قرآن کی حیثیت سے متعارف ہیں، اس لئے ان کا کوئی قرآنی درس سنا یا جائے۔ ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ ۲½ ۶ بجے ہال بھی خالی کرنا تھا تاہم حاضرین کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے سورۃ القمر کے ابتدائی ۲۰ منٹ کا درس سنایا گیا۔ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزہ کی اصل حقیقت جب سامنے آئی تو سامعین وجد میں آ گئے۔ قومی ترانہ سے جلسہ حسن و خوبی سے اختتام کو پہنچا۔ اس کے بعد بک سٹال مہمانوں کی توجّہ کا مرکز بنا رہا۔ پمفلٹس اور کتب کی خرید کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔

اگلے ہفتہ مقامی جریدہ اخبارِ وطن میں اس جلسہ کی کارروائی کے متعلّق خبر شائع ہوئی۔

مرسلہ مقبول محمود فرحت نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لندن

مرتبہ ثریا عندلیب

دین کی باتیں

۱۔ قرآن اجتماعی زندگی کا تصوّر دیتا ہے۔ قرآن کا نظام اجتماعی انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہوتا ہے۔ اسی سے وہ دین بنتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۳/۱۰۳ اس کی بنیادی سند ہے وہ اعتصام بحبل اللہ کو اجتماعی قرار دیتا ہے، انفرادی نہیں۔ اسی کو اجتماعی زندگی یا جماعتی نظم و نسق کہتے ہیں۔

۲۔ قرآن نے مشاورت کا اصول دیا ہے ۳/۱۵۸ : ۴۲/۳۸ اس نے مشاورت کی مشینری نہیں بتائی۔ یہ جزئیات اس نے اُمّت کی صوابدید پر چھوڑ دی۔ وہ اُمّت جو اُمّتِ واحدہ ہوگی وہ اُمّت جو قرآن کو اپنا آئین تسلیم کرے گی۔ طریقۂ کار آج کیا ہے کل کیا ہوگا یہ تبدیلی ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ قرآن کے دیے ہوئے اصول سے نہ ٹکرائیں۔ شوریٰ کے اندر معیار ہوگا تقویٰ، برادری نہیں، دولت نہیں، پروپیگنڈا نہیں، ڈنڈا نہیں، استبداد نہیں، فرعونیت نہیں، پامانیت نہیں، صرف تقویٰ ہوگا۔ خلافتِ راشدہ میں کوئی فرقہ نہیں تھا کیونکہ ان کا طریقہ مندرجہ بالا تھا۔ جہاں مرکزیعنی سنٹرل اتھارٹی فیصلہ کرتی تھی کہ قرآن کے فلاں حکم یا اصول کی تفصیل کیا ہوگی۔ اس نظام کے نہ رہنے کی وجہ سے یہ سارا فساد پیدا ہوگیا اور نظام اس لئے نہ رہا کہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل اور چیز کا متشدّد عقیدہ پیدا کر دیا گیا۔

۳۔ ہجرت آیات اللہ کو محکم کرنے کا پہلا مرحلہ ہے۔ آیات کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو بھی قرآن کے مطابق معاملات کے فیصلے کرے وہ مومن اور جو ایسا نہ کرے وہ کافر۔ ۵/۴۴-۴۵-۴۷

۴۔ آیاتِ قرآن کو محکم کرنے کے لئے اپنی مملکت کا ہونا لابدّ ہے کیونکہ فیصلے حکومت کے تحت ہوتے ہیں۔ زندگی کے متعلق جتنے ہی نزاعی امور ہیں وہ انفرادی ہوں، اجتماعی ہوں یا بین الاقوامی ہوں سب کے فیصلے حکومت کے تحت قرآنی آیات کے مطابق ہوں گے۔ ۴/۶۵-۶۰-۱۰۵

۵۔ آیات قرآنی کو محکم کرنا ہی عملِ صالح ہے۔ ۱۱/۱۷ ۱۶/۴۴ ۱۶/۶۴ ۱۶/۸۹

۶۔ تکذیبِ آیات کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زبان سے تو آیات کو مانتے ہیں لیکن عملی اس کے مطابق نہ کریں۔ بلکہ من مانی کرتے رہیں۔

۷۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ اسی عذابِ مبین کی تاریخ ہے جو تکذیبِ آیات کا نتیجہ ہوتا ہے ۳۶/۱۵، ۲۳/۴۸، ۲/۱۰، ۱۶/۳۶۔

۸۔ محض فکری طور قرآن کو سمجھ لینا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ جب تک اس کے احکام کے سامنے دل کا جھکاؤ نہ ہو۔ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا جائے۔ ۵۴/۲۱

۹۔ نہ اپنی اچھی صلاحیتوں کے اچھے بدل کو دوسرے کو منتقل کیا جا سکتا ہے نہ کسی کے بُرے کام کے نتیجے کو کوئی دوسرا روک سکتا ہے۔ یہ ہے قرآن کا قانونِ مکافاتِ عمل۔ ۶/۵۲، ۲۰/۱۰۹، ۲/۱۲۳، ۵/۳۶۔

۱۰۔ دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے پھر وہ ہر مقام پر مفاہمت کرتا ہے۔ حق کبھی مفاہمت نہیں کرتا مفاہمت سودا بازی ہوتی ہے۔ مفاہمت کرنے والوں کا کوئی کیریکٹر نہیں ہوتا ۱۶/۱۵، ۱۱/۱۳، ۱۱۵/۴۶، ۲۹/۵۱، ۳۹/۴۵۔

۱۱۔ قرآن ایسی ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ خوبی، خوبی اور برائی، برائی نظر آئے۔ "یا اللہ! مجھے وہ نگاہ دے جو ہر شے کی حقیقت کو دیکھ لے"۔ حدیث نبویؐ

۱۲۔ قرآن کہتا ہے کہ "یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مومنین پر غالب آجائیں۔ لیکن جو اس وقت نظر آرہا ہے جو موجودہ حقیقت ہے کہ تمام مسلمان اقوام کفار کے پیچھے لگی ہیں، ان کے سامنے سرنگوں ہیں، تو کا اس مطلب کیا ہوا؟ مطلب یہ کہ یہ مسلمان، مسلمان نہیں ہیں ۳/۱۳۸، ۸/۵۹، ۶۵/۶۶۔

۱۳۔ مسلمان ہونا تو آسان نہیں ہے۔ مسلمان کہلانا البتہ بہت آسان ہے۔ ۶۸/۳۵

۱۴۔ جو حق پر ہے مفاہمت کا تصور بھی اس کے دل میں نہیں آسکتا۔ اگر وہ حق پر ہے تو وہ ایسی گفت و شنید کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

۱۵۔ جس نے کہا کہ میں اپنے مقام سے ہٹتا ہوں۔ اس کا کوئی مقام نہیں ۱۰/۱۵، ۱۱/۱۱۳، ۳۹/۴۵، ۶۰/۹۔

۱۶۔ قرآن کا نظام قائم کرنے پر ہی فرقے مٹیں گے۔ فقہ کے مطابق نظام تو ہر فقہ کی گرہ کو مزید مضبوط کرتے چلے جانا ہے۔

۱۷۔ دنیا میں پہلے دن سے لے کر آخری دن تک جو فرد بھی ایمان لاتا ہے وہ ایک قوم کا فرد بن جاتا ہے۔ پیچھے سے بھی جو انسانیت چلی آرہی ہے اس میں یہی دو گروہ تھے۔ حزب اللہ یا حزب الشیطان، برادری یا قوم بننے کی وجہ اشتراکِ ایمان ہے۔ ماضی کے لوگ بھی اس میں شامل ہیں اور مستقبل کے بھی۔ ۳۳/۵، ۴۹/۱۰، ۵۹/۱۰۔

۱۸۔ خدا کی صفتِ ربوبیت کو بہت وسیع پیمانے پر عام کرنا عذاب سے بچنا ہے۔ ۶/۴۵، ۱۰/۱۰۔

۱۹۔ کمزوری کے بغیر نرمی اور جبر و استقلال کے بغیر قوت یہ ہے اسلامی مملکت کی حدِ امتیاز۔

۲۰۔ خلافت اور ملوکیت میں فرق۔ خلیفہ سے پوچھا جائے گا کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا۔ اگر وہ اس

سوال کے جواب میں خدا کے قانون پر پورا اُترے گا تو خلافت ہے ورنہ ملوکیت ۔ ۵/۴۸ ، ۳۸/۲۲ ، ۳۸/۲۶

۲۱۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت ایک خزانچی کی ہوتی ہے کہ وہ اس میں سے خدا کے احکام کے مطابق جہاں تقسیم کرنا ہے وہاں تقسیم کرے اور اپنے لئے صرف اپنا روزینہ لے ۔ فرمانِ نبویؐ ۔

۲۲۔ نہ کسی کے پاس ضروریات سے زیادہ رہے نہ کسی کی ضرورت رُکی ہوئی رہے یہ ہے اسلامی مملکت ۴۱/۱۰

۲۳۔ خدا کا مال کہہ دینا اپنی ذمہ داری سے فرار ہے ۔ بیت المال بھی قوم کا مال ہوتا ہے اور قوم اس کے متعلق پوچھنے کا حق رکھتی ہے ۔

۲۴۔ جو بام سے نیچے نہیں اُترتا وہ اسلامی مملکت کا سربراہ نہیں ہوتا ۔

۲۵۔ یہ انسان بنے بنائے گھڑے گھڑائے نہیں ملتے ۔ یہ انسان بنانے پڑتے ہیں ۔ سب سے پہلی چیز انسان سازی ہے اور انسان وہی بنا سکتا ہے جو خود انسان ہو ۔ اور انسان کا معیار صادق و امین ہے ۔ ۲۵/۳۴ ۔

۲۶۔ خدا کا قانون فوراً ہی گرفت نہیں کر لیتا ۔ وہ موقع دیتا ہے تاکہ وہ اصلاح کر لے ۔ اسے بار بار تنبیہ اس لئے کی جاتی ہے جب یہ مہلت کا وقت ختم ہوتا ہے اور اصلاح نہیں کی جاتی تو پھر کشتی کے ڈوبنے کا وقت آجاتا ہے ۔ اور پھر ایک ساعت اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتی ۔ ۴۴/۲۹ ، ۱۰/۱۱ ، ۱۳/۳۲ ، ۳۵/۴۵ ، ۱۶/۶۱ ، ۱۸/۵۸،۵۹ ۔

۲۷۔ دنیا میں اس وقت جو کچھ کشت و خون ، فساد انگیزیاں ، سلب و نہب ہو رہا ہے وہ اس لئے کہ ہر قوم صرف اپنے لئے جی رہی ہے ۔

۲۸۔ سب سے بڑی غلامیٔ رزق کی محتاجی کی ہوتی ہے محکومیت تو اس کے پیچھے خود بخود چلی آتی ہے ۔ جتنے مستبد حاکم ہوتے ہیں وہ رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جاتے ہیں اور یوں لوگوں کو غلام بناتے ہیں ۔ ۷۹/۲۴ ۔

۲۹۔ وہ جو اپنے آپ کو پوری آبادی میں بھری سوسائٹی میں تنہا محسوس کرے اس کی تنہائی کا مداوا بننا اسے تنہا محسوس نہ ہونے دینا یہ ہے دین ۔

۳۰۔ محکومیت کی انتہا کیا ہے ؟ احساس کے ہر دروازے پر مہر لگا دینا صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ ۔ حکمران کی ساحری یہ کرتی ہے ۔

۳۱۔ یہ قرآن کی انفرادیت ہے کہ اس نے جو لفظ انتخاب کیا اس کی جگہ دوسرا لفظ لگانے سے قرآن قرآن نہیں رہیگا اور انسان مشرک ہو جائے گا ۔

۳۲۔ مہلت کے وقفے کے دوران بھی بار بار پلٹ کر اپنی غلط روش پر آجانا مہلت کے وقفے کو ضائع کرنا ہے ۔ اس کے ختم ہونے پر آخر میں گرفت بڑی سخت ہوتی ہے ۱۰/۴۹ ، ۲۳/۴۳ ۔

۳۳ یہ صرف قرآن ہی ہے جسے خدا نے تعلیم کیا اور صرف یہی وحی ہے ۔ یہی مکمل ہے ۔ یہی غیر متبدّل ہے اور وحی اس سے خارج اور کہیں نہیں ہے یہ سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی دو آیات میں بتایا گیا ہے

بقیہ بر صفحہ ۳۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بشیر احمد عابد
ریاض۔ سعودی عرب

ربطِ باہمی

آج سے تقریباً پچاس سال قبل، جہالت، توہم پرستی اور اندھی تقلید کی جس سرزمین میں "تحریکِ طلوعِ اسلام" کی تخم ریزی کی گئی تھی اور تعصب، تنگ نظری اور نفرت کی جس فضا میں اسے پروان چڑھنا تھا اسے مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی بھی یہ باور کرنے کو تیار نہ تھا کہ یہ ننھا سا پودا کبھی اپنی نال پر مضبوطی سے کھڑا ہو پائے گا۔ لیکن اس تحریک کے کارکنوں نے جن کے سامنے اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا صاف صاف تصور ہے، اپنے قائد علامہ غلام احمد پرویزؒ کی سرفروشانہ قیادت اور بصیرت افروز رہنمائی میں اس خلوص و لگن سے اس کی آبیاری کی کہ جس سے یہ نہ صرف کہ محکم و استوار ہوئی بلکہ اس کی مثال ایک ایسے شجرِ طیبہ کی مانند ہو گئی جس کے متعلق قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ۔ $\frac{14}{24}$ کہ اس کی جڑیں پاتال میں نہایت مضبوط ہوں اور شاخیں آسمان کی پہنائیوں میں جھولا جھول رہی ہوں۔ یعنی وہ ہر زمانے میں ثمر بار رہے اور اس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہ آئے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام اس دن سے، اپنے ربّ کی ربوبیتِ عظمیٰ کے پروگرام کو مشہود طور پر مستحقِ حمد و ستائش بنانے کے لئے نہایت تیزی سے سرگرمِ عمل ہے۔ اس کی عملی جدّوجہد اور مطلوب و مقصود اُن مُرسلٰتِ عُرفًا کی طرح ہے، جو ہر زمانے میں ان نظریات، تصوّرات اور نظامہائے زندگی کو جن میں بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت نہ ہو خس و خاشاک کی طرح اُڑا کر رزمگاہِ حیات سے دُور پھینک دیں اور اس کی جگہ صالح نظامِ زندگی کو سرسبز و شاداب بنا کر دُور دُور تک پھیلا دیں۔

جن حضرات نے حصولِ پاکستان کی جنگ لڑی ہے یا لڑتے دیکھی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سب سے شدید مقابلے کا سامنا مذہبی محاذ پر تھا۔ ہمارے نام نہاد علماء اور مولوی حضرات نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ ہر منبر و محراب سے طنز و استہزاء کے تیر برسانا اور ہر کسی کو اپنے جاہلانہ فتوؤں سے کافر و مُرتد قرار دے کر واجب القتل ٹھہرانا ان کا فرضِ مذہبی تھا۔ قرآنِ کریم کی من مانی تاویلوں اور من گھڑت تفسیروں سے پوری معاشرتی فضا کو مکدّر کیا ہوا تھا اور حالت یہ تھی کہ حصولِ پاکستان کی کوئی کرن بھی کہیں سے پھوٹتی نظر آتی یہ ماہانی لشکر ٹڈی دَل کی طرح اس پر چھا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ قائدِاعظمؒ اور علامہ اقبالؒ ان تمام مخالف قوتوں کا بھرپور مقابلہ کر رہے تھے لیکن مذہبی

مخالفت ایک ایسا محاذ تھا جس کے لئے ایک نہایت باصلاحیت اور بیباک قیادت کی ضرورت تھی جو انتہائی مربوط اور منظم طور پر نظریۂ پاکستان کا دفاع کر سکے۔ یہ سعادت علامہ پرویزؒ کے حصہ میں آئی۔ اور آپ نے قائداعظمؒ کی ایماء پر ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجراء کر کے اس محاذ کی ایسی ناکہ بندی کی کہ پھر اس کے بعد نہ تو قائداعظمؒ کو اور نہ ہی تحریکِ پاکستان کے کسی دوسرے رہنما کو کبھی بھی کسی مقام یا موقعہ پر نظریۂ پاکستان سے متعلق مذہبی فرنٹ پر ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ علامہ پرویزؒ نے اپنی بیمثال بصیرت، فرقانی سے مذہبی پیشوائیت کے ہر حملے کا منہ توڑ جواب دیا اور انہیں ہر محاذ پر شکست دے کر تحریکِ پاکستان کے قافلے کو آگے بڑھایا۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی، قائداعظمؒ کے ہاں نہایت عقیدت و احترام سے پذیرائی ہوتی تھی۔ آپ واحد شخصیت تھے کہ جنہیں قائداعظمؒ سے ملاقات کے لئے پروٹوکول کا پابند نہیں ہونا پڑتا تھا۔

آج ہماری نئی نسل کو اس امر کا اندازہ کرنا کافی مشکل ہے کہ ہمارے نام نہاد علماء طبقے نے حصولِ پاکستان کی راہ میں کیا کیا پہاڑ نما رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ کیونکہ ایک تو آج تک کسی نے تحریکِ پاکستان کی صحیح تاریخ ہی نہیں مرتب کی، جس کی بنا پر اس تحریک کے اغراض و مقاصد اور کارکنوں کے کردار کی اہمیت کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنا کافی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اسی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ قائداعظمؒ کی شخصیت حتیٰ کہ خود نظریۂ پاکستان متنازعہ فیہ معاملات بن گئے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ ہمارے یہ نام نہاد علماء جس رُوپ میں اس وقت قوم کے سامنے آ رہے ہیں اور قوم کی قیادت کا جس اعتماد سے دعویٰ کر رہے ہیں، اس سے تو یہی تأثر ملتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے سب سے جیالے کارکن یہی تھے اور پاکستان کا قیام انہی کی سر توڑ کوششوں کا نتیجہ تھا۔ قرآنِ کریم نے اس طبقے کی نشاندھی آج سے چودہ سو سال پہلے کر دی تھی، اور جماعتِ مومنین کو متنبہ کر کے فرمایا۔ "ان کی ظاہری وضع قطع بڑی خوش آئند نظر آتی ہے اور وہ انسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اور جب یہ باتیں کرتے ہیں تو ایسے معصومانہ انداز سے کہ ہر شخص انہیں کان لگا کر سُنے اور سچ باور کرے، لیکن ان کی اندرونی حالت ایسی ہے جیسے گھن کھائی ہوئی لکڑیاں جنہیں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا ہو۔ نہ خود اعتمادی اور نہ زندگی کی توانائی بظاہر بڑے محکم اور پائیدار، بباطن بالکل کھوکھلے اور بے جان۔ بزدل ایسے کہ کہیں ذرا سا کھٹکا ہو تو ان کی جان نکل جائے کہ ہم پر کوئی آفت آئی۔ دل میں ہر وقت دھڑکہ کہ کہیں ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی؟ یہ تمہارے دشمن ہیں سو تم ان سے بہت محتاط رہو۔ ان پر خدا کی مار۔ انہوں نے کس قسم کی اُلٹی روش اختیار کر رکھی ہے"؟ (۶۳/۶) مزید فرمایا۔ "ان کی گفتگو بڑی پُرکشش اور سحر انگیز ہوتی ہے۔ حالانکہ مخالفت میں یہ سب سے آگے ہوتے ہیں۔ اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں"۔ (۲/۲۰۴)، (۹/۸۰۹)

لیکن ان تنبیہات کا کیا فائدہ جب ہم قرآنِ کریم کو اس نقطۂ نظر سے پڑھتے ہی نہیں کہ اس سے نصیحت بھی حاصل کرنی ہے۔

ان بزعمِ خویش علماء حضرات نے قبل از تقسیم جس شدّت سے مطالبۂ پاکستان کی نفی کی تھی، بعد از تقسیم اس سے دوگنی شدّت کے ساتھ اس قطعۂ ارض پر اپنی ناجائز وراثت کا دعویٰ کر دیا۔ نتیجتاً اس منزل کے وہ رہرو جنہوں نے نہایت جگر پاش مشقتوں کے بعد ہندو انگریز غلامی کے ایک بحرِ ظلمات کو پیرا تھا، ابھی اس طویل اور ہمّت شکن مسافت کی تکان بھی اُتار نہ پائے تھے کہ ایک بار پھر گمنامی کے بحرِ ذخار میں دھکیل دیئے گئے۔ یہ سراسر ظلم اور ناانصافی تھی۔ بہرحال، حصولِ پاکستان کی جدّوجہد میں تحریکِ طلوعِ اسلام کے سرفروش اور فعال کارکنوں کی بے مثال ایثار اور کارکردگی کو ممکن ہے تاریخ کی بے رحم گود میں حفاظت نہ مل سکے، لیکن میزانِ خداوندی میں ان کا عمل ذرّہ بھر ضائع نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے بارے میں نویدِ جانفزا ہے:-

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو لوگ ضابطۂ خداوندی کو اپنا زندگی کا نصب العین بنا لیں گے اور اس کے متعیّن کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، تو ان کے حسنِ عمل کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوگا۔ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ (۱۸/۳۰) یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدوں کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان کا محسوس پیکر، قائداعظمؒ کی ذہانت اور مسلمانانِ برّصغیر کے بے پناہ صبر و استقامت کا مرہون ہے لیکن بنیادی طور پر اس کا خمیر اقبالؒ اور پرویزؒ کی فکر نے اُٹھایا تھا۔ لہٰذا ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ قیامِ پاکستان ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر تحریکِ طلوعِ اسلام بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ آنے والا کوئی بھی مؤرخ جب تعصّب اور تنگ نظری سے بلند ہو کر تاریخِ پاکستان کا غیر جانبدارانہ جائزہ لے گا تو تحریکِ طلوعِ اسلام کے کارکنوں کے ایثار و خلوص کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

حصولِ پاکستان اگرچہ بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن یہ مقصود بالذّات نہیں تھا۔ اس سرزمین میں نظامِ خداوندی کے شجرِ طیبہ نے ثمر بار ہونا ہے۔ اس قطعۂ ارض کو اس لئے حاصل کیا گیا تھا تاکہ یہاں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اصولوں کی بنیاد پر وحدتِ اُمّت کی تشکیل کی جا سکے اور ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں ہر فردِ معاشرہ کی عزتِ نفس کو قانونی تحفّظ میسّر ہو۔ جہاں ہر کوئی محنت کرے اور کسی کی محنت کا استحصال نہ ہو، جہاں تمام امور عدل و احسان کی رُو سے طے پائیں اور سامانِ حفاظت و پرورش ہر فرد کو یکساں طور پر وافر مقدار میں دستیاب ہو۔ تکمیلِ پاکستان کا یہ مرحلہ یعنی قیامِ نظامِ خداوندی، اہم بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس کے لئے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ صبر و استقامت کے ساتھ سعی و عمل کی ضرورت

ہے۔ اور پہلے کی طرح یہاں پر بھی تحریکِ طلوعِ اسلام کے کارکنوں کو ہی ہمّت کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس مقصد کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے جن اعلیٰ اصولوں اور اقدار کی ضرورت ہے ان کا صحیح علم اس وقت صرف اسی کو ہے۔ اس وقت اس سلسلے میں جتنی کوششیں بھی ہو رہی ہیں وہ سب باطل پر مبنی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ قطعۂ زمین جو آپ نے خدائے عظیم و برتر کا تختِ اجلال بچھانے کے لئے حاصل کیا تھا، اس پر ناجائز قبضہ ہو گیا ہے۔ ہمارا کام ان ناجائز قابضین کی تجاوزات کو ہٹا کر خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار کے مطابق معاشرے کی تعمیر کرنی ہے۔ بظاہر مشکل کام ہے لیکن باطل آخر باطل ہے، یہ اسی وقت تک سر پیکار رہتا ہے جب تک کہ حق سامنے نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط کہہ دو کہ اب نظامِ حق و صداقت کا دور آگیا، اور باطل کی تخریبی قوتوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ (۱۷/۸۱) اس لئے کہ تخریبی قوتیں صرف اس وقت تک باقی رہتی ہیں جب تک حق و صداقت کی تعمیری قوتیں برسرِ عمل نہ آئیں۔ ان کی موجودگی میں تخریبی قوتیں ٹھہر ہی نہیں سکتیں۔ (۱۷/۸۱) آپ سرزمین پاکستان کے جائز وارث ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فلسطین کی ارضِ مقدّس کو بنی اسرائیل کے نام لکھ دیا تھا اسی طرح یہ زمین آپ کے نام لکھ دی گئی ہے۔ اب یہ ہماری اوّلین ذمّہ داری ہے کہ اس میں خدا کا قانون نافذ کریں اگر ایسا نہیں ہوگا تو یاد رکھیئے! بنی اسرائیل کو تو صرف ۴۰ سال تک محروم رکھا گیا تھا۔ ہماری نسل در نسل اس سے محروم کر دی جائے گی۔ ہماری صلاحیتیں کبھی نشو و نما نہیں پا سکیں گی۔ ہماری سب کوششیں نتائج سے عاری ہونگی اور ہم کبھی بھی انسانی سطحِ زندگی کی لطافتوں، آسائشوں اور فراوانیوں سے سیراب نہیں ہو سکیں گے۔

جس ایثار، خلوص، جذبے اور لگن سے قیامِ پاکستان کے لئے کوششیں کی گئی تھیں قیامِ نظامِ خداوندی کے لئے اس سے کہیں زیادہ گھمبیر جدّ و جہد کی ضرورت ہے۔ اس جدّ و جہد کو جتنے منظّم طور پر چلایا جائے گا، نتائج اتنے ہی درخشاں اور فوری برآمد ہوں گے۔ کسی تحریک کی کامیابی کے لئے تنظیم اور رابطے کی کیا اہمیّت ہوتی ہے، اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔ فریضۂ رسالت کی عظیم ذمّہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد حضورؐ کا پہلا کام یہ تھا کہ ایسے رفقائے سفر تیار کئے جائیں جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو۔ اسی لئے آپؐ کو المزّمّل کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی عمل ترسیل کو بہتر طور پر سرانجام دینے والا۔ قائدِ اعظمؒ نے قوم کو جو تین زرّیں اصول دیئے ان میں ایک تنظیم کا تھا۔ اور علّامہ اقبالؒ کے نزدیک اس کی کیا اہمیّت تھی اسے یوں بیان کیا ہے

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں

رابطے اور تنظیم کی کمی کی وجہ سے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں، ان کی فہرست تو نہایت طول طویل ہے، لیکن اگر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو یہ نہایت خوفناک اور بعض اوقات ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں۔ مجھے اور تو علم نہیں کہ کہاں کہاں اور کس کس کو اس کمی نے نقصان پہنچایا، لیکن یہاں سعودی عرب میں حالت یہ ہے کہ ریاض، جدہ، طائف اور دمام میں مقیم احباب کے مابین رابطہ نہ ہونے کی بنا پر ایک عرصے تک تحریک کے فروغ کے لئے کوئی مثبت قدم اُٹھایا نہ جا سکا۔ جیسا کہ پہلے بھی میں طلوعِ اسلام کے اوراق میں اعتراف کر چکا ہوں کہ مجھے شمعِ قرآنی کی روشنی میں چلے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا، اس کی بھی ایک وجہ تحریکِ طلوعِ اسلام میں رابطے اور تنظیم کی کمی تھی۔ اگر یہ پیغام مجھ تک پہلے پہنچ جاتا تو میں ایک عرصہ تک اس نور سے محروم نہ رہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہ جانے اب بھی کتنے قلبِ سلیم اس دھڑکن کے لئے بیتاب ہوں گے۔ اگر یہ پیغام ان تک مؤثر، متواتر اور منظم طور پر پہنچایا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اسے قبول نہ کریں اس میں بہت زورِ دروں ہے لیکن اس کے ابلاغ کے لئے عمدہ ربط اور ایک نہایت اعلیٰ تنظیم کی ضرورت ہے۔ ایسی سہولت نہ ہونے کی بنا پر اور تو اور مالی اعانت بھی مناسب طور پر نہیں کی جا سکتی۔ سعودی عرب میں رہتے ہوئے دو، اڑھائی صد ریال یعنی ہزار بھر پاکستانی روپے ہر کوئی بآسانی بطور عطیہ دے سکتا ہے۔ صرف ریاض میں طلوعِ اسلام کے چند احباب گذشتہ چودہ، پندرہ سال سے مقیم ہیں۔ اگر یہ اس قسم کے کسی ضابطے کے پابند ہوتے تو آج تک بلا کسی تردّد اور مشقّت کے مرکزِ طلوعِ اسلام کو لاکھوں روپے فراہم کر چکے ہوتے۔ ان تلخ حقائق سے اندازہ کر لیجئے کہ مرکز یا صحیح الفاظ میں ہماری اپنی مرکزیّت کو کس قدر نقصان پہنچا۔ اگر اس میں ہم اِن احباب کو بھی جو طائف، جدّہ اور دمّام میں مقیم ہیں اور جن کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے، شمار کریں تو یہ اعداد و شمار مزید بھیانک دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تو رہے مالی نقصانات جن کی تلافی پھر بھی کبھی نہ کبھی ہو جائے گی، لیکن اس قسم کی بے قاعدگیوں اور بے ضابطگیوں سے جو علمی اور سماجی دھچکے لگتے ہیں ان کی تلافی بہرحال، ناممکن ہوتی ہے۔ باباجیؒ کی فکر کو اتنا نقصان شاید نہ پہنچتا اگر ہم مربوط اور منظم طور پر ان کے خلاف پروپیگنڈے کا توڑ پیش کرتے۔ اس کے برعکس ہوتا یہ رہا کہ خود اس فکر سے وابستہ کچھ احباب بعض اوقات کم علمی کی بنا پر اور بعض اوقات تربیّت کی کمی سے اس پروپیگنڈے کی صداقت کی دلیل بنتے رہے۔ میں نے اپنے طور پر رائے عامہ کا جو جائزہ لیا ہے اس کے مطابق عوام کی اکثریت باباجیؒ کے نام ہی سے بے خبر ہے۔ جو جانتے ہیں ان کی اکثریت آپ کو قادیانی یا فرقہ اہلِ قرآن سے متعلق سمجھتے ہیں اور میرے خیال میں یہ غلط فہمی انکارِ حدیث کے پروپیگنڈے سے پیدا ہوئی ہے۔ آپ کی فکر سے خال خال لوگ واقف ہیں اور وہ بھی سطحی طور پر۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ

کی فکر کی فلاسفیکل بنیادوں سے آپ کے شاگردوں میں سے بھی بہت کم لوگ متعارف ہیں۔ یہ سب خامیاں، کوتاہیاں اور کمزوریاں دور ہو سکتی ہیں اگر ان کا ربط و ترتیب سے جائزہ لیا جائے اور منظّم طور پر سامنا کیا جائے۔

برادرانِ عزیز! اگر آپ بھی ان حقائق کو اسی طرح محسوس کرتے ہیں اور ان نقصانات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں تو آیئے عہد کریں کہ ہم :-

* قرآنِ کریم کی دی ہوئی مستقل اقدار اور اصول و قوانین پر پوری پوری دسترس حاصل کریں گے۔
* نبی اکرمؐ کی عقل و بصیرت، صبر و استقامت، عمدہ اخلاق، اعلیٰ کردار، جانثاری اور سرفروشی کو مشعلِ راہ بنائیں گے۔
* ارکانِ دین کی محسوس شکلوں کی مکمّل حفاظت اور پیروی کریں گے۔
* اپنی صفوں کو نہایت منظّم اور مربوط رکھیں گے۔
* ہر کام باقاعدگی اور پابندیٔ وقت کے ساتھ سرانجام دیں گے۔
* اپنے جملہ عطیات و صدقات سے مرکز کی بھرپور مالی اعانت کریں گے۔
* مجلّہ طلوعِ اسلام خود بھی خریدیں گے اور دوسروں کو بھی خرید کر دیں گے تاکہ قوانینِ خداوندی کی بھرپور نشر و اشاعت ہو۔

میں اس حقیقت کو پھر دُہرا دینا چاہتا ہوں، کہ یہی وہ بلند مقاصدِ حیات ہیں جن کے لئے جماعتِ مومنین کے افراد ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے، زندگی کی متلاطم ندّیوں کو مردانہ وار پار کئے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں تعلیم ہی یہی دی گئی ہے کہ۔ یَآاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ٥ ($\frac{3}{199}$) تم اپنے مسلک پر نہایت استقامت سے جمے رہو، اور ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بنو، ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ کر رہو۔ اور ہر قدم پر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یہی وہ روش ہے جس سے تمہیں سفرِ حیات میں کامیابی حاصل ہو گی۔

بقیہ دین کی باتیں از صفحہ ۳۳

۳۶۔ اسلامی نظام کی اساس محکم 'باز پرس' ہے۔ $\frac{16}{93}$ ۔

۳۷۔ انسانی جذبات تو انسانی خون کے اندر حلول کئے ہوتے ہیں۔ مگر قانون پر جذبات کو غالب نہ آنے دینا یہ ہے عدل، یہ ہے مساوات۔ $\frac{38}{50}$ ، $\frac{29}{99}$ ۔

محمد عمر دراز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آئینۂ قرآن — مَا اَنْزَلَ اللّٰہ کیا ہے؟

زِ قرآں پیشِ خود آئینہ آویز!

اپنی زندگی کے معاملات کے فیصلے مَا اَنْزَلَ اللّٰہ کے مطابق نہ کرنے والے کافر ہیں، ظالم ہیں اور فاسق ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵/۴۵)

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵/۴۷)

مَا اَنْزَلَ اللّٰہ کیا ہے؟

قرآن اور حدیث یا صرف قرآن؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لسانِ مبارک سے قرآن کہلواتا ہے:-

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَۃً ؕ قُلِ اللّٰہُ شَھِیْدٌ ۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ ۟ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ ..... ○

"ان سے کہو! کونسی شہادت سب سے بڑی ہے؟ کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی شہادت ہے۔ اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے"۔

قرآن، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کیوں وحی کیا گیا؟ ارشاد ہے:-

لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ ..... ○

"تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں (غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے) آگاہ کردوں"!

صرف مخاطبینِ رسولؐ ہی نہیں، ہم بھی:-

وَمَنْ م بَلَغَ ؕ ..... (۶/۱۹)

"اور انہیں بھی جن تک یہ بعد میں پہنچے"!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو (تمام باتیں اور) سب سے اچھی باتیں اس قرآن کے ذریعے بتائی جاتیں تھیں جو آپؐ کی طرف وحی کیا گیا :-

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ ... (۱۲/۳)

"اے رسول ہم اس قرآن کو آپ پر وحی کے ذریعے نازل کر کے (انبیاء سابقہ اور اقوام گذشتہ کی) سرگذشتیں بہترین طریق پر بیان کرتے ہیں۔"

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی زندگی کے دوران آپ پر قرآن نازل کیا جاتا رہا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا (۷۶/۲۳)

"ہم نے تجھ پر (اے رسول) قرآن بتدریج نازل کیا ہے۔"

حضور رسالتمآبؐ کو اللہ تعالیٰ نے کس چیز کی تعلیم دی؟ صرف قرآن کی!

الرَّحْمَٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ○ (۵۵/۱-۲)

"الرحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔"

وہ کون لوگ ہیں جو "اس قرآن" کی جگہ کوئی دوسرا قرآن مانگتے ہیں یا اسے بدلنا چاہتے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس نہیں آئیں گے۔

قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ... (۱۰/۱۵)

"جو لوگ ہمارے (قانونِ مکافات کے) سامنے آنے کی اُمید نہیں رکھتے وہ آپ سے کہتے ہیں کہ اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا پھر اس (کے مطالب) میں کچھ ردّ و بدل ہی کر دو۔"

ایسے لوگوں کو حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں فرماتے ہیں :-

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ... (۱۰/۱۵)

"ان سے کہہ دیجئے کہ یہ چیز میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکوں۔"

آپؐ ان لوگوں سے فرماتے ہیں کہ میرا مستقل طریقہ (سنّت) تو یہ ہے کہ :-

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ... (۱۰/۱۵)

"میں صرف اس وحی کی پیروی (اتّباع) کرتا ہوں جو میری طرف نازل ہوتی ہے۔"

آپؐ صاف، واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر میں اس قرآنی (وحی) کے علاوہ

کسی اور چیز کا اتّباع کروں تو یہ معصیتِ خداوندی ہوگی (یعنی اللہ کے احکام سے سرتابی) اور میں ایسا کر نہیں سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اللہ کے قانون کی ہمہ گیری ایسی وسعتوں کی مالک اور اس کی گرفت ایسی محکم ہے کہ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا:۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۰/۱۵)

"اگر مجھ سے میرے ربّ (کے قوانین) کی معصیت ہو جائے تو میں (اس کے قوانین کی گرفت سے بچ نہیں سکتا اس لیے میں) اس کی گرفت سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس کی سزا بڑی سخت ہوا کرتی ہے۔"

میرا اتّباعِ وحی کا مسلک (سنّت) اس لیے بھی ہے کہ:۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ ..... (۲۸/۸۵)

"اللہ نے آپ پر قرآن (کا اتّباع) فرض کیا ہے۔"

اور اس لیے بھی کہ اس قرآن میں بنی نوعِ انسان کے لیے ہر قسم کے مضامین (احکام) بیان کر دیے ہیں۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ..... (۳۰/۵۸)

لہٰذا اس کتاب (قرآن) میں کوئی ایسی بات نہیں چھوڑی گئی جس کا بتایا جانا ضروری تھا:۔

..... مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ..... ○ (۶/۳۸)

"ہم نے اس کتاب میں کوئی (ایسی) چیز (جس کا بتایا جانا ضروری تھا) نہیں چھوڑی۔"

یہ ضابطۂ زندگی صدق و عدل کے تمام پیمانوں پر پورا اُترتے ہوئے مکمل ہو گیا ہے۔

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ..... ○ (۶/۱۱۵)

"تیرے ربّ کے کلمات (احکام) صدق و عدل (واقعیت اور اعتدال) کے اعتبار سے کامل ہیں۔"

اور یہ ضابطۂ زندگی (قرآن) ایسے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ توازن بدوش اور سیدھا ہے:۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ ..... ○ (۱۷/۹)

"یہ قرآن (کاروانِ انسانیت کو، سفرِ زندگی میں) وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ متوازن اور سیدھی ہے۔"

اور اُس ربّ العالمین نے، جو جملہ قوتوں اور وسائل کا مالک ہے۔ اس کی حفاظت کا ذمّہ خود اپنے اوپر لے کر یہ ضمانت بہم پہنچا دی کہ نہ تو یہ قرآن انسانی دست برد کی پہنچ میں ہے اور نہ ہی یہ

حوادثِ ارضی و سماوی سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا :-

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ..... ○ (۶/۱۱۵)

"تیرے خدا کے کلام (قرآن) کو کوئی بدلنے (کی طاقت رکھتے) والا نہیں۔"

کیونکہ :-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (۱۵/۹)

"ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

یہ ہے اُس قرآن کی پوزیشن جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بتدریج نازل کیا گیا اور جس کے سوا اُس نے کچھ اور نازل نہیں کیا۔ جو کاروانِ انسانیت کے سفرِ زندگی میں صدق و عدل کے تمام تقاضوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے، مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے۔

اس قرآن کے ساتھ **مثلہٗ معہٗ** کے دعوے کرنے والوں کو اس نے صاف صاف الفاظ میں قیامت تک کے لیے چیلنج دے دیا کہ ہماری کتاب کی "مثل" رکھنے کا دعویٰ کرنے والے جن و انس کے تمام تر گروہ، ایک دوسرے کی تم جتنی بھی مدد کر سکتے ہو کر دیکھو اور اس قرآن کی مثل بنا کر لاؤ۔ ہم تمہیں کہے دیتے ہیں کہ تم کبھی ایسا نہیں کر سکو گے :-

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ (۱۷/۸۸)

"(ان سے) کہہ دیجئے کہ اگر ساری دنیا کے انسان (حضری) اور جن (بدوی) سب کے سب مل کر بھی کوشش کریں کہ اس قرآن کی "مثل" (یعنی اس جیسا) قرآن بنا لیں تو وہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، خواہ وہ ایک دوسرے کے کتنے ہی مددگار کیوں نہ بن جائیں۔"

انسان جتنی چاہے صنعت کاریاں کرے، ربّ العزّت کا ارشاد ہے کہ اس کا نازل کردہ قرآن تمام اندوختۂ علم انسانی اور اس کی جملہ کاوشوں سے بہتر ہے۔

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ (۴۳/۵۸)

اور جب تک اُمّتِ مسلمہ (بالخصوص) اور باقی انسانیت بالعموم اس قرآن کو اپنی زندگی کا حَکَم (فیصلہ کرنیوالا) قرار نہیں دیتے، اور اس کے زندگی کے جملہ معاملات کے فیصلے قرآن کی عظیم بارگاہ سے نہیں لیتے "اللہ" کی میزان میں ان کا شمار کافروں (انکار کرنے والوں)، ظالموں (ہر شے کو اس کی صحیح جگہ پر نہ رکھنے والوں)

اور فاسقوں (اپنے لیے اللہ کے مقرر کردہ قالب 'PATTERN' سے باہر نکل جانے والوں) میں ہوتا رہے گا، چاہے یہ اپنے لیے 'مسلم' مومن یا کوئی بھی نام کیوں نہ رکھ لیں اور اللہ کا ارشاد ہے کہ:-

i۔ کفر کا راستہ اختیار کرنے والے دنیا بھر کے خزانے اور ان جیسے اتنے اور دے کر بھی تباہی کے جہنم سے نہیں بچ سکتے:-

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ (۵/۳۶)

ii۔ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی:-

..... إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ○ (۶/۲۱)

"وہ (اللہ) ظالموں کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیتا۔"

اور ہم اس کا نام و نشان تک مٹا دیتے ہیں:-

..... لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ○ (۱۴/۱۳)

"ہم ان ظلم کرنے والوں کو تباہ کر دیں گے۔"

iii۔ فاسقین کبھی بھی راہِ ہدایت نہیں پا سکتے کیونکہ اللہ کا فیصلہ ہے:-

..... وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ○ (۵/۱۰۸)

"اللہ کی ہدایت قومِ فاسقین (اپنے لیے متعین کردہ راہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جانیوالے) کو کبھی نہیں ملتی۔"

اور آخر الامر ان کا بھی نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے:-

فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ ○ (۴۶/۳۵)

"سو فاسق ہی (آخر الامر) برباد ہوں گے۔"

تو خدا کے لیے سوچیے کہ ہمیں زندہ رہنے اور اس زندگی میں کامیاب و کامران بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ خدا کسی کے لیے بھی اپنے قانون میں تبدیلی نہیں کرتا۔

لَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲)

کوئی ہے جو قوم کی غلط راہوں کو بدل کر انہیں صحیح راستے پر چلائے؟

..... فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ○ (۵۴/۱۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خالد محمود سید
الریاض (سعودی عرب)
اپریل ۱۹۸۸ء

قرآن اور سیاست — لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اس مقالہ کے دو حصے ہیں۔ پہلے نہایت مختصر طور پر اُن سیاسی نظریات کا سرسری ذکر کیا جائے گا جو اب تک انسان نے اپنی عقل اور تجربے سے وضع کئے ہیں۔ یہ تذکرہ محض اس لئے ضروری ہے کہ اس بارے میں قرآن مجید کا رویہ بتایا جا سکے۔ دوسرے حصے میں اس سیاسی نظام کے نقوش پیش کئے جائیں گے جو قرآن نے انسان کے لئے تجویز کیا ہے۔

حصہ اوّل: فکرِ انسان — لَا اِلٰہ

ابتداء

پہلے پہل جب انسانی بستیاں اس کرۂ ارض پر نمودار ہوئیں تو لوگ تعداد میں کم تھے۔ ذرائع آمد و رفت بھی محدود اور سُست رفتار تھے۔ انسانی تہذیب کے دوائر میں عقل اور ذہانت کی اہمیت ابھی پوری طرح کھُل کر سامنے نہیں آئی تھی۔ ایسے میں جسمانی طاقت فیصلہ کن عنصر تھی۔ عمومی طور پر طاقت اور (نتیجتاً) سربراہی مرد کے ہاتھ میں تھی۔ خاندان کا سربراہ باپ اور اسی طرح قبیلہ کا سردار وہ مرد جو زیادہ طاقتور ہوتا تھا۔ نزاعی معاملات میں سربراہِ خاندان یا سردارِ قبیلہ کی بات حُکم اور قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ سرداری چونکہ جسمانی طاقت کے بل پر ہوتی تھی اس لئے سردار عام طور پر قبیلے کا سب سے زیادہ مالدار شخص بھی ہوتا تھا یا ہو جاتا تھا۔ یہ جاگیرداری اور زمینداری کی ابتدا تھی۔ یہی طریقِ سیاست ترقی پا کر موروثی بادشاہت بنا یعنی (MONARCHY) ایک بڑے علاقے میں بہت سے قبائل مل کر اپنا ایک بڑا سردار چُن لیتے تھے۔ طاقت ور ہونے کی صورت میں سرداری یا بادشاہت اُسی خاندان میں رہتی تھی ورنہ دوسرا چھین لے جاتا تھا۔ ایسے کسی بادشاہ کا وجود جو معاملات میں آخری فیصلہ کا حق اور اختیار رکھتا ہو، بہت پرانے زمانے سے ضروری خیال کیا جاتا رہا ہے۔ تیسری صدی ق۔م کے مشہور ہندو سیاستدان اور چندر گپت موریہ کے وزیرِ اعظم چانکیہ (کوٹلیا) نے اپنی سیاسی تصنیف ارتھ شاستر میں لکھا ہے: بادشاہ نہ ہو تو طاقت ور کمزوروں کو ہڑپ کر جاتے ہیں[1]

[1] ENCYCLOPAEDIA BRITTANICA — 'WITHOUT KING, IN A STATE OF NATURE, THE STRONG DEVOUR THE WEAK'.

لیکن اس زمانے تک انسانی تہذیب کے قافلے نے خاصی مسافت طے کر لی تھی۔ آبادی بھی بڑھ چکی تھی اور عقل و خرد اور علم بھی آگے آ چکے تھے۔ ایسے میں محض جسمانی طاقت اقتدار کے لئے کافی جواز نہ رہا تھا اور لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے طاقتِ محض کے علاوہ کوئی اور (فلسفیانہ) جواز مہیا کرنا ضروری ہو چکا تھا۔ اس کے لئے بنیاد تو وہی رکھی گئی یعنی جسمانی قوت، لیکن اس کا منبع کہیں اور کر دیا گیا۔ اس وقت تک انسانی زندگی میں مذہب کا بہت عمل دخل ہو چکا تھا۔ اس لئے کہا جانے لگا کہ بادشاہ کو بادشاہ خدا نے بنایا ہے۔ اس طرح بادشاہ کی قوت کو

ظلّ اللہ

آسمانی سند حاصل ہونے لگی۔ یہی بادشاہ کے خدائی اختیارات کا عقیدہ ہے جو ابھی زمانہ حال تک بھی یورپ کے نظامِ سیاست کی بنیاد تھا۔ اب بادشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ (ظل اللہ) اور ایشور کا اوتار کہا جانے لگا۔ قدیم زمانے میں فراعنہ مصر اور شاہانِ بابل وغیرہ کا تذکرہ اس پر شاہد ہے۔ جاپان کے بادشاہ کو آج بھی سورج دیوتا کی نسل تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ چانکیہ بھی بادشاہ کے خدائی اختیارات کو تسلیم کرتا ہے۔[2] قدیم چینی فلسفی کنفیوشس (CONFUCIOUS) اور قرونِ وسطیٰ کے مغربی فلاسفہ SPINOZA اور ST. AUGUSTINE اور سب سے بڑھ کر MICHIAVELLI بھی تقریباً یہی کہتے رہے کہ بادشاہ کا وجود اور اس کے اختیارات کا وسیع ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ اب چند لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حاکموں کا فرض ہے کہ وہ رعایا کی بہبود کے لئے کام کریں[3]۔ بہر کیف، مرورِ زمانہ کے ساتھ انسان کے سیاسی نظریات میں تبدیلی یہ آئی کہ مذہبی پیشواؤں — پروہتوں، پادریوں، مولویوں وغیرہ — نے بھی اقتدار پر رال ٹپکانا شروع کی اور کچھ اس قسم کے خیال کو لے کر بڑھے کہ اگر بادشاہ خدائی اختیارات ہی سے حکومت کرے گا تو اس کے زیادہ حقدار مذہبی پیشوا ہیں کہ ان کا تعلق خدا سے بادشاہ کی نسبت زیادہ قریبی، براہِ راست اور ثابت شدہ ہے۔ مذہبی علماء اور پیشوا خدا کے قانون اور مرضی کو بادشاہوں سے زیادہ جانتے ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کا یہ رویہ مختلف

تھیاکریسی

تھا ان کے اس پہلے رویہ سے جس میں مثلاً بابل کے حمورابی کے قوانین اور مہاتما بدھ کے دھرم، کے تصور میں خدا کا نمائندہ زمین پر بادشاہ ہوتا تھا۔ بابل کے شہنشاہ اور ہندوستان کے اشوکِ اعظم (تیسری صدی ق م) اس فلسفے کا نتیجہ تھے۔ اگرچہ اس انتظام میں بھی اکثر اوقات آخری فیصلہ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔[4] چانکیہ نے لکھا ہے کہ ملا سیاسی نظام کا پرزہ نہیں لیکن

۲۔ ارتھ شاستر بحوالہ برٹینکا

۳۔ سینٹ AQUINAS / SUMMA THEOLOGICA بحوالہ برٹینکا

۴۔ والٹر آل مین ۔ A HISTORY OF POLITICAL THOUGTS IN MIDDLE AGES.
'THE EMPEROR IS WITHIN THE CHURCH, NOT ABOVE IT_ST. AMBROSE in late 4th. CENTURY.

بادشاہ مذہبی قانون سے بالاتر نہیں"۔ لیکن اب مذہبی لیڈروں نے اقتدار پر براہِ راست الٰہی حق جتانا شروع کیا۔ یہ صورتِ حال دُکھی انسانیت کے لئے "کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا" کے مصداق تھی۔ یعنی مُلّا سیاسی اقتدار کے بغیر ہی کیا کم مصیبت تھے کہ اب یہ قوت بھی ان کے ہاتھ آ گئی۔ ہمارے زمانے میں اس کی متعدد مثالیں ملتی

دوہری مصیبت

ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک قبرص (CYPRUS) کا صدرِ مملکت آنجہانی MAKARIOS ایک پادری تھا۔ پاکستان میں ایک عرصہ سے مذہبی پیشوا سیاسی اقتدار پر دانت جمائے بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ محبوبۂ دلنواز ابھی تک اُن کے ہاتھ نہیں آئی ہے۔ ایک عام آدمی تو اُس وقت کے تصور ہی سے کانپ جاتا ہے جب مذہبی اور سیاسی قوت ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ اس کی تازہ ترین مثال ایرانی انقلاب ہے۔ جہاں سیاسی قوت ایک مذہبی رہنما کے ہاتھ میں ہے اور جو صورتِ حال وہاں اب ہے وہ مغربی پریس کے شور و غوغا کے باوجود بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں، اپنے آپ کو اللہ کی نشانی اور اللہ کی روح کہنے اور کہلانے والے یہ مذہبی (اور اب سیاسی بھی) پیشوا اپنے جذبۂ انتقام و نفرت کے ہاتھوں کیا کیا کچھ کر رہے ہیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ سابق شہنشاہ کے سینکڑوں ماتحت اور معمولی عمّال کو قتل کی سزائیں دنیا کے کس قانون سے واجب اور جائز ہے؟ اور اب جو سابق شاہ کی واپسی کے لئے قریب پچاس امریکی بطور یرغمال پکڑے گئے ہیں۔ اُن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایران کے خلاف سازشوں کے مجرم ہیں۔ اگر ایسا ہے تو اُن پر مقدمہ چلایا جائے۔ اور پھر کیا امریکہ اگر یرغمالیوں کے بدلے سابق شاہ کو ایران کے حوالے کر سکے تو کیا ان یرغمالیوں کے جرائم معاف کر دیئے جائیں گے؟ کس قانون کے تحت! کس کی قوت (AUTHORITY) سے؟ حیرت ہے کہ اسلامی انقلاب لانے کے دعویدار یہ کیسے بھول گئے کہ اسلام نے معاف کر دینے کا سبق دیا ہے "بدلہ لینے کا نہیں"! اور یہ کہ داعیٔ اسلام نے فتح مکہ کے موقع پر عام معافی (GENERAL AMNESTY) کا اعلان کر کے رہتی دنیا تک تمام انقلابیوں اور فاتحین کے لئے ایک درخشندہ نظیر قائم کر دی تھی! بہرکیف یہ تو تھا سیاستِ حاضرہ پر ایک جملہ معترضہ۔ بات یہ ہو رہی

دین و دُنیا کی ثنویت

تھی کہ تاریخ کے سیاسی قافلے کے سفر میں اب یہ منزل آئی کہ بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں میں اقتدار کے لئے رسّہ کشی شروع ہوئی۔ نتیجتاً دونوں طاقتور گروہوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا۔ "تو مرا حاجی بگو من ترا مُلّا بگو" کے مصداق اب اقتدار کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ملکی معاملات سیاسی رہنما نپٹانے لگے اور مذہبی معاملات مُلّاؤں کے حصے میں آئے[1] اس سے معصوم

---

[1] RELIGION AND THE RISE OF CAPITALISM by R.H.TAWNEY – P:20
'THE FORMER (State) PAYS A SHADOWY DEFENCE TO RELIGION, THE LATTER (CHURCH) DO NOT MEDDLE WITH THE EXTERNAL FABRIC OF THE POLITICAL & SOCIAL SYSTEM WHICH IS THE CONCERN OF THE FORMER'.
RENDER UNTO CEASER THE THINGS THAT ARE CEASER'S; AND UNTO GOD THE THE THINGS THAT ARE GOD'S.

انسانوں کی زندگی دینی اور دنیاوی خانوں میں بانٹ دی گئی تاکہ بادشاہ اور ملّا اپنے اپنے علاقے میں راج کر سکیں۔ اسی تقسیم سے ملّا بادشاہوں کی زیادتیوں کو مذہبی اسناد عطا کرنے لگے اور بادشاہ مُلّاؤں سے آشیرباد لینے لگے۔ یہی ہے وہ مشہور و معروف خدا اور قیصر (GOD اور CEASER) والا فلسفہ[1] دلچسپ ہوگا اگر یہ دیکھا جائے کہ اس فلسفہ کی بنیاد اور شروعات کیا ہیں۔ مشرق کی عظیم شخصیات میں سے ایران کے جناب زرتشت کا نام کسی لمبے چوڑے تعارف کا محتاج نہیں لیکن مختصراً غالباً ضروری ہوگا۔ اِن کی شخصیت تعلیم اور زمانے

زرتشت

کے متعلق تو بات بہت طویل ہے، اشارۃً یہ عرض ہے کہ اُن معدودے چند آدمیوں سے ہیں جن کی تعلیمات نے تمام نسلِ انسانی پر بہت گہرے اور دیرپا نقوش مرتسم کئے ہیں لیکن اکثر قدیم حکماء کی طرح ان کے متعلق معلومات بھی ظنّ و قیاس کے پردوں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ حتیٰ کہ بالتحقیق ابھی تک ان کا زمانہ ہی متعیّن نہیں کیا جا سکا ہے[2] یہی حال ان سے منسوب تعلیم کا ہے اور نتیجتاً ان کے مُصلح محض یا پیغمبر ہونے کے متعلق بحث ابھی ناتمام ہے۔ بہرکیف، اتنا طے ہے کہ جناب زرتشت کے فلسفہ کی بنیاد ثنویت (DUALISM) پر ہے جس کے مطابق اس کائنات میں دو قوتیں یا خدا سرگرمِ عمل ہیں۔ روشنی (یعنی نیکی) کا خدا یزداں اور تاریکی (یعنی بدی) کا خُدا اہرمن ہماری یہ کائنات اور زندگی انہی دو مخالف قوتوں یا خداؤں کی کشاکش کی داستان ہے۔ اسی فلسفہ ثنویت کے بیج سے دیگر کونپلیں پھوٹی ہیں جیسے خیر و شر، نیکی و بدی، حاکم و محکوم، آقا و غلام، رحمان و شیطان اور پھر ہمارے ہاں دین اور دُنیا۔ ان قوتوں یا حقائق کا وجود تسلیم، لیکن انسانوں نے عملی زندگی میں جس طرح اس فلسفہ کو بنیاد بنا کر اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو دو خانوں میں بانٹا ہے وہ تمام انسانیت کے لئے بہت تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ یہی فلسفہ ایک خیال کے مطابق ایران سے ہندوستان ہوتا ہوا یونان پہنچ کر ارسطو اور افلاطون کے افکار کی بنیاد بنا[3] ہندوستان کے قدیم ہندو مذہب کے عناصر اور پرانے آریائی (آریہ اور ایران کی جڑ ایک ہی ہے) کی زندگی کا قدرے گہرا تقابلی مطالعہ کرنے سے ہندومت اور مذہبِ زرتشت میں تعلق نظر آسکتا ہے (مثلاً دانوں کی تقسیم، آگ کا تقدس وغیرہ) جناب زرتشت کے ایک شاگرد (یا تابع یا متبع یا پیروکار[4] مزدک MAZDAK تھے۔

۱۔ انجیلِ مقدس۔ باب متی۔ آیت (XXI-21)

۲۔ غلام احمد پرویز۔ مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں۔ باب زرتشت۔

۳۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ مقالہ: نظامہائے سیاسیہ (POLITICAL SYSTEMS)۔

۴۔ عام خیال یہ ہے کہ جناب مزدک کا زمانہ، رسول اللہ سے ذرا پہلے کا ہے (ISLAM & CAPITALISM BY MAXIME RODINSON - P:22) اور انہیں جناب زرتشت کا شاگرد کہا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ خود زرتشت کا زمانہ متعیّن نہیں اس لئے مزدک کا تعلق زرتشت سے متعیّن کرنا مشکل ہوگا۔

جنہوں نے زرتشت کے فلسفے کی ترویج و ترقی میں بہت کام کیا۔ ان کا ذکر آگے آتا ہے۔ بہرکیف، ثنویت کے اس فلسفے کی بنیادوں پر دین و دُنیا کی عمارت اُٹھائی گئی اور پھر مذہبی رہنماؤں نے، جو اس ملی بھگت میں برابر کے شریک تھے! اس عمارت میں وہ وہ جدّتیں کی ہیں کہ الامان والحفیظ! بزعمِ خود، خدا کی عطا کردہ سند (AUTHORITY) تو ان کے پاس تھی ہی، بس پھر کیا تھا۔ جیسا مفید خیال آیا، خدا سے منسوب کر کے کہنا شروع کیا۔ زندگی کو دین و دُنیا کے ٹکڑوں میں بانٹا، اعمال کو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں تقسیم کیا، ذمّہ داری اور کردار کو حکمرانوں کے ساتھ مل کر ذاتی اور عوامی (PUBLIC اور PRIVATE) کے خانوں میں ڈالا۔ اور اس طرح بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں نے مل کر انسانیت کے حصے بخرے کئے اور اپنے اپنے حصّے پر حکومت کرنے لگے۔ شاہوں نے انسانوں کے جسم اور ملّاؤں نے اُن کے اذہان تصرّف میں لے لئے۔ اور ایک بڑی حد تک یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس انتظام کو ذرا ترقی دے کر

سیکولرزم

مختلف حالات کے لئے ڈھالا گیا تو سیکولر (SECULAR) جنہیں لادینی بھی کہا جاتا ہے، حکومتیں وجود میں آئیں۔ ہُوا یہ ہے کہ دین و دنیا کی ثنویت اُن معاشروں میں تو بخیر و خوبی چلتی رہی، جو قریب قریب ایک ہی جیسے عقائد کے لوگوں پر مشتمل (HOMOGENUS) تھے۔ مثلاً قرونِ وسطیٰ کی عیسائی حکومتیں، خلافتِ راشدہ کے بعد (بالخصوص عہدِ عباسیہ میں) مسلمان حکومتیں، حالیہ انقلاب سے پہلے سے ایران کی سلطنت (اب وہاں تھیاکریسی یا پاپائیت رائج ہے) اور خود ہمارے موجودہ مسکن سعودی عرب میں آج تک یہی نظام رائج ہے۔ لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے نتیجے میں ایسے معاشرے وجود میں آئے، جہاں ایک سے زیادہ عقائد کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ایسے ممالک میں حکمرانوں اور ملّاؤں کی سہولت کے لئے، بہ امرِ مجبوری، دین و دنیا کی ثنویت کو ترقی یافتہ (DEVELOPED) کر کے اس سیاسی وجود میں لایا گیا جو (SECULARISM) کہلاتا ہے۔ اس نظام میں کم از کم نظریاتی طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ مُلک کا مذہب وہ ہے جو اکثریت کا ہے لیکن دیگر مذاہب کو پوری پوری آزادی دی جاتی ہے۔ ملکی معاملات حکمران چلاتے ہیں اور اکثریتی اور اقلیتی گروہوں کے مذہبی معاملات اپنے اپنے مولویوں، پادریوں اور پنڈتوں کے سپرد ہوتے ہیں۔ اہلِ قانون اسے ملکی قانون (PUBLIC LAW) اور ذاتی قانون (PERSONAL LAW) کے ناموں سے جانتے ہیں۔ اس نظام کی مثالیں مغربی دنیا کی بیشتر حکومتیں اور ہمارے اپنے وطنِ عزیز پاکستان کی حکومت ہے۔ بزعمِ خود، زیادہ ترقی یافتہ اور روشن خیال ممالک حقیقت کو برملا کہہ دیتے ہیں یعنی یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ مملکت کا کوئی سرکاری مذہب نہیں اور یہ کہ مُلک

۱۔ ع یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج ـ "صوفی و مُلّا ملوکیت کے ہیں بندے تمام" اقبالؒ
ارمغانِ حجاز۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا پہلا مشیر۔

میں آباد ہر انسان کو اپنی مرضی سے اپنی مذہبی زندگی چُننے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے (حقیقت میں ایسا ہوتا ہے یا نہیں، یہ ایک الگ داستان ہے) اس کی ایک مثال دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت ہے۔

نظریۂ ضرورت

اس نظام میں ہوتا یہ ہے کہ انتظامِ ملکی کی بنیاد کسی مستقل فلسفہ یا نظریہ پر نہیں ہوتی۔ جوں جوں حالات بدلتے ہیں، اصول بھی بدل جاتے ہیں۔ صرف ایک ہی چیز غیر متبدّل رہتی ہے اور وہ ہے مادی ضرورت۔ اسے پُورا کرنے کے لئے آئین میں ترمیمات، قوانین میں تبدیلی اور اصولوں میں ردّوبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً کچھ عرصہ پہلے تک برطانیہ میں شراب نوشی اور ہم جنسی (HOMO-SEXUALITY) قانوناً ممنوع تھے، آج دونوں قانوناً جائز ہیں۔ یہی چیز ہے جس کو آجکل ہمارے کچھ پاکستانی حلقے نظریۂ ضرورت کا نام دے رہے ہیں۔ یہ محض الفاظ ہیں کسی فلسفی یا مکتبِ فکر کا باقاعدہ نظریہ نہیں۔ یہ وہی سیکولرزم ہے۔ یعنی حالات کے مطابق جو مُفید اور مناسب نظر آئے، وہی کیا جائے اس میں مقصد کسی مستقل قدر (PERMANENT VALUE) کا تحفّظ نہیں بلکہ اپنے مفاد کی بقا ہوتا ہے۔ آج دنیا کے اکثر جمہوری ممالک اسی راہ پر گامزن ہیں۔ یہاں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اور یہ نکتہ کسی بھی سیاسی نظام میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہ ہے اقتدارِ اعلیٰ یعنی کسی

اقتدارِ اعلیٰ

معاملے میں آخری فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہوگا؟ ہم نے اب تک کی گفتگو میں جن سیاسی نظاموں اور فلسفوں پر نظر ڈالی ہے ان میں اقتدارِ اعلیٰ یا تو ایک انسان کے پاس ہوتا ہے اور یا چند انسانوں کے ایک گروہ کے پاس جیسے موروثی بادشاہت میں بادشاہ کے پاس، تھیاکریسی میں مُلّا کے پاس، ثنویت کے نظام میں بادشاہ اور مُلّا دونوں کے پاس ہوتا ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ سلسلہ اس کرّہ ارض کے بیشتر علاقوں میں آج بھی جاری ہے اور انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کا شکاری ہے[1]۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اس مقام پر ذرا رُک کر یہ دیکھ لیا جائے کہ اب تک ہماری بات چیت کے متعلق قرآن کریم کا رویّہ کیا ہے

ذرا ٹھہریئے

سب سے پہلے تو اصولی طور پر قرآن نے یہ اعلان کیا کہ جہاں تک حاکم و محکوم کا تعلق ہے، حاکمیت صرف خدا ہی کو سزاوار ہے۔ اور کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منوائے[2] یعنی اقتدارِ اعلیٰ خدا کے پاس رہے گا، انسانوں کے پاس نہیں۔ (اس کی تفصیل

۱۔ "ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے = قیامت ہے کہ انسان نوعِ انسان کا شکاری ہے" اقبال (بانگِ درا طلوعِ اسلام)

۲۔ دیکھئے سورہ آلِ عمران آیت ۷۹

آگے آئے گی) دوسرا اہم اصول جو قرآن نے بیان کیا وہ یہ ہے کہ سیاسی اقتدار (امامت) وراثت کے حق سے نہیں ملے گا[1] گویا موروثی بادشاہت یکسر غیر قرآنی ہے[2]۔ تیسری اہم بات قرآن نے یہ بتائی ہے کہ مذہبی پیشواؤں کے لئے سیاسی اقتدار تو دُور کی بات ہے، ان کا اپنا وجود ہی ناپسندیدہ ہے[3]۔ یہ طبقہ فطرتاً دعمداً یا سہواً معاشرے کو تباہ و برباد کرنے میں لگا رہتا ہے ؏

دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد!

یعنی یہ لوگ نہ صرف مخلوقِ خدا کو گمراہ کرتے ہیں، خُدا کے قانون کو غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں بلکہ خود کچھ کماتے نہیں اور دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش اُڑاتے ہیں۔ یہ مترفین ہیں اور کسی بھی معاشرہ کا انتہائی ناپسندیدہ عنصر ؏

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے ۔ فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

بیچارے اقبالؒ اس تباہ کن عنصر کا ماتم کرتے رہے۔ اُن کے خیال میں انہی کی وجہ سے مسلمانوں میں قحط الرجال ہؤا ہے[4] وہ انہیں اندیشہ و نظر کا فساد کہتے تھے[5] اور ڈرتے تھے کہ قیامت کے روز ان کے نامۂ اعمال سے خود اللہ تعالیٰ شرمندہ ہو جائیں گے[6]۔ بادشاہوں اور ملوکیت کے متعلق بھی اقبالؒ قرآن کی ہمنوائی میں کہتے ہیں ؏

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا ۔ اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز!

اسی چیز کو انگریزی زبان میں کہتے ہیں (POWER TENDS TO CORRUPT & ABSOLUTE POWER CORRUPTS ABSOLUTELY) ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کا رویہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے متعلق کیا ہے۔ جہاں تک ان دونوں گروہوں کے بنیادی فلسفہ دین و دنیا کی ثنویت کا تعلق ہے اس کے متعلق بھی اس کتابِ عظیم نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ یہ سب غلط ہے مجوسیوں کا عقیدہ اہرمن و یزداں حقیقت پر مبنی نہیں اس لئے کہ خدا ایک ہی ہے اور روشنی و تاریکی اس

۱۔ دیکھئے سورہ بقرۃ آیت ۱۲۴

۲۔ دیکھئے سورہ یونس آیت ۵۹

۳۔ دیکھئے سورہ التوبہ آیت ۳۴ ؏ یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے ۔ گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ ۔ بالِ جبریل

۴۔ ؏ شیر مردوں سے ہؤا بیشۂ تحقیق تہی ۔ رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی! ″

۵۔ ؏ نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے غرض مجھ کو ۔ یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد! ″

۶۔ ؏ کریں گے داورِ محشر کو شرمسار اِک دن ۔ کتابِ صوفی و مُلّا کی سادہ اوراقی! ″

۷۔ ؏ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں! ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق! ۔ اجتہاد (ضربِ کلیم)

کی پیدا کردہ ہیں (الانعام: ۱) حق ایک ہی ہے اور لاشریک ہے (بنی اسرائیل: ۱۱۱)، (الانعام: ۵۷)۔ یہ دوئی تو باطل کا طریق ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے　　(ضربِ کلیم۔ ٹیپو کی وصیت)

اس دورُخی زندگی میں انسان کی تباہی ہے۔ جب انتظامِ ملکی اور معاملاتِ مذہبی الگ الگ کر دیئے جاتے ہیں، چاہے وہ کسی SECULAR مملکت ہی میں کیوں نہ ہوں، تو یہ تہذیبِ انسانی کی بے بصری کی دلیل ہے۔ وہ انتظام جہاں انسانی معاملات کا کچھ حصہ تو خدائی قانون کے تحت (سمجھا جاتا) ہو اور کچھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تحت، قرآن کے نزدیک ناپسندیدہ ہے (المائدۃ: ۴۷، ۴۰-۴۴)۔ ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی　　ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی　　دوئی چشمِ تہذیب کی بے بصیری
(بالِ جبریل۔ دین و سیاست)

ایسی لادین سیاست مُردہ ہے اور تاریکیوں کا باعث ہے ؎

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں　　کنیزِ اہرمن و دُوں نہاد و مُردہ ضمیر

اسی لادین سیاست نے انسانی معاشرے کو وہ حکومتیں بھی عطا کیں جو اس انسانی اقتدار کی بدتر شکلیں تھیں۔ ایسی حکومتوں میں ہٹلر، مسولینی اور نپولین وغیرہ کی شخصی و فوجی حکومتیں ــــــ شامل ہیں۔ اصل بات تو اقتدارِ اعلیٰ ہی کی ہے۔ حکومت کی شکل چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ بادشاہت، مذہبی پیشوائیت، فوجی آمریت یا سِول مستبد حکمران، یہ سب انسانی اقتدارِ اعلیٰ ہی کی مختلف شکلیں ہیں جہاں معاملات کا آخری فیصلہ ایک یا چند انسانوں کے پاس ہوتا ہے۔

ایک نیا خیال

تاریخِ انسانی میں نظامہائے سیاسی کا قافلہ یہاں تک پہنچا تھا کہ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں مختلف خیال پیدا ہونے لگے اور دلوں میں اس استبداد کے خلاف لہریں اُٹھنے لگیں۔ اب انسان نے بحیثیتِ مجموعی پہلے سے ذرا ہٹ کر سوچنا شروع کیا۔ کچھ فلسفی اور دانش ور قسم کے لوگوں نے یہ کہا کہ انسانی معاشرے میں معاملات کے آخری فیصلہ کا حق اقلیت کو نہیں بلکہ اکثریت کے پاس ہونا چاہیئے، یعنی اقتدارِ اعلیٰ عوام کے ہاتھ میں ہو۔ مغربی دنیا میں پہلے پہل یونان میں قدیم حکما، ارسطو اور افلاطون وغیرہ نے سیاسی نظریات پیش کئے تھے جہاں شہریوں کی ایک مجلسِ شوریٰ منعقد ہوتی تھی، مگر یہ نظامِ جمہوریت بہت بودا تھا اور از حد غیر حقیقی و خلافِ فطرت بنیادوں پر اُستوار کیا گیا تھا۔ افلاطون اور ارسطو کے خیال میں انسان پیدائشی طور پر آقا و غلام (حاکم و محکوم) ہوتے ہیں۔ آقا اقلیت میں اور غلام اکثریت میں تھے۔ ان

کے حقوق بھی برابر نہ تھے اور حاکموں کی اقلیت غلاموں کی اکثریت کے سامنے جوابدہ نہ تھی۔ لیکن خود افلاطون ہی نے اس نظام کی خرابیوں کو محسوس کر لیا تھا (۳۷۸۔ ق۔م)۔ اُس کا کہنا تھا کہ حکمرانوں کی اقلیت محکوموں کی اکثریت کا استحصال کرتی ہے اور اس طرح ایک مصیبت بن جاتی ہے[1] اس کے شاگرد ارسطو نے بھی ایسے ہی حالات کا مشاہدہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ انسان کے لئے قانون کے دائرے میں رہنا بہت ضروری ہے[2]۔ اس قدیم زمانے کے بعد ماضی قریب میں انسان نے کھل کر یہ کہنا شروع کیا کہ اقلیت کا اقتدار اکثریت پر نہیں ہونا چاہیے اور یہ کہ حکومت آئین اور قوانین کے تحت باقاعدہ نظام سے چلائی جانی چاہیئے۔ اس خیال کے پیش کرنے والوں میں پہلے پہلے لوگوں میں ST. T.AQUINAS[3] تھا۔ اس کے علاوہ ایک (اور) پادری JOHN OF SALISBURY[4] نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں لکھی ہیں۔ ان حضرات کے بعد مغربی اندازِ فکر سے جمہوریت سے قریب تر فلسفہ ایک انگریز JOHN LOCKE[5] نے پیش کیا۔ علمِ سیاست میں اس فلسفی کا اثر بہت گہرا ہے اس کے فلسفے کا مرکزی نکتہ لوگوں کی جان و مال کی حفاظت، امن کا قیام اور فلاحِ عامہ تھا جو حکومت کی ذمہ داری تھی، لیکن یہ ذمہ داری ایک معاہدہ کی رُو سے پوری ہوتی تھی اس لئے اسے THEORY OF CONTRACT کہا جاتا ہے۔ مال کی آزادی کے ساتھ ساتھ ضمیر کی آزادی اور نتیجتاً مذہب کی آزادی ضروری تھی۔ حکومت کا نظام آئینی طریقے سے مجلسِ شوریٰ کے ذریعے چلتا تھا۔ ان فلسفوں کے پیشِ نظر ایک اہم سوال یہ تھا کہ صحیح اور غلط کا معیار کیا ہوگا؟ یعنی ملک میں کوئی قانون بنانے کی بنیاد کیا ہوگی؟ مغربی دنیا کی اکثریت عیسائیت کے تجربے سے بہت خوش نہ ہوئی تھی اور نتیجتاً مذہب سے دُور ہٹتی جا رہی تھی اس لئے یہ لوگ مذہبی دنیا سے کوئی ضابطہ قوانین لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ تب یہ فلسفہ پیش کیا گیا کہ عوام ہی حکومت کریں یعنی "GOVERNMENT OF THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE, BY THE PEOPLE"[6] والی بات ہو۔ عوام کے مقتدرِ حقیقی ہونے کے اس تصوّر کو بڑھانے میں ایک فرانسیسی مفکر روسو

عصرِ حاضر

۱۔ افلاطون۔ 'THE REPUBLIC' ۳۷۸ ق۔م

۲۔ ارسطو۔ 'POLITICS' ۳۳۲-۳۳۵ ق۔م

۳۔ SUMMA THEOLOGICA تیرھویں صدی عیسوی

۴۔ POLICRATICE ۱۱۵۹ء

۵۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

۶۔ آئین ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ROUSSEAU پیش پیش تھا۔ اس نے سن ۶۲-۱۷۶۳ء میں جو تصانیف کیں اُن میں اپنا مشہور GENERAL WILL یا عوامی خواہش، کا تصور پیش کیا۔ عوام کے حق میں یوں اُٹھنے والی، مغربی دنیا میں، یہ پہلی آواز تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ کسی بھی معاملے کا فیصلہ عوام کی رائے یا رضی معلوم کر کے کیا جائے کیونکہ لوگوں کی اکثریت جو کہے گی وہ لازم درست ہوگا۔ انسان کی فکری کاوشوں کا یہ نتیجہ ہمارے زمانے میں جمہوریت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آجکل دنیا کے اکثر متمدن ممالک اسی نظام کو اپنائے ہوئے ہیں۔

جمہوریّت

اس تصور نے چونکہ ایک دنیا کو ایک لمبے عرصے سے بے حد متأثر کر رکھا ہے اس لئے اس پر قدرے تفصیلی بات کرنا ضروری ہے۔ جمہوریّت کے متعلّق دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ نظام انسانی معاشرے کے لئے بہترین ہے کہ یہ فکرِ انسانی کی صدیوں کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں لوگوں کی مرضی سے لوگوں پر حکومت کی جاتی ہے اور رائے عامہ کے مطابق قوانین وضع کئے جاتے ہیں لیکن اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ دعوے سب کے سب سچے نہیں ہیں۔ مثلاً جب کسی معاملے میں ووٹ ڈالے جائیں تو فرض کیجئے کہ ایک حلقے میں کل ایک سو ووٹ ہیں اور تین اُمیدوار۔ ایک اُمیدوار کو چالیس ووٹ ملتے ہیں اور دوسرے دو کو تیس تیس۔ اس طرح چالیس ووٹ حاصل کرنے والا اُمیدوار کامیاب کہلائے گا جبکہ ساٹھ فیصد اکثریت اُس کے حق میں نہ تھی۔ دوسرے اس حسابی کھیل کود سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اکثریت جو بات کہے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ درُست ہی ہو۔ صحیح بات وہ ہے جو درحقیقت صحیح ہو نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنے لگیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثریت ہو یا اقلّیت، ہوتے تو وہ انسان ہی ہیں اور اس لحاظ سے انسانی خامیوں اور لغزشوں سے بھی مبرّا نہیں ہوتے۔ اس بات کی کیا ضمانت دی جا سکتی ہے کہ لوگوں کی اکثریت اپنے ذاتی جذبات و مفادات سے بلند ہو کر ایک ایسا فیصلہ کرے گی جو عقل پر مبنی ہو اور تمام ملک اور پورے معاشرے کے لئے مفید ہو؟ یا وہ لوگ جو اکثریت کے ووٹوں سے منتخب ہو کر قانون ساز اداروں میں پہنچتے ہیں، کیا ضرور ہے کہ وہ معاشرے کے باقی لوگوں سے ذہنی لحاظ سے برتر ہوں؟ اس میں غلطی اور خطا کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس بات کا اعتراف اب مغربی مفکّرین نے بھی کر لیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں منعقدہ بین الاقوامی ادارے U.N.O کے ایک ذیلی ادارے UNESCO کی ایک تحقیق کے مطابق ——"یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے اس لئے اقلّیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے خلاف AGITATION کرے اور اکثریت کے فیصلے کو بدلوا دے [۱]"۔ اتنا ہی نہیں، کچھ دانشوروں نے تو یہ تک کہہ دیا ہے کہ

۱۔ بحوالہ "DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION" ۔ اقوامِ متحدہ ۱۹۴۷ء

جمہوریت ایک فریب سے زیادہ کچھ نہیں۔ پروفیسر الفریڈ کوبن کے الفاظ میں ـــ "اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصوّر کرنا عملی ممکنات میں سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقے کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جاتے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں، مملکت میں بدترین قسم کی آزادیٔ اختیارات پیدا کر دیتا ہے[1]"

جمہوریت کے نظریئے اور عمل میں یہی فرق اور مشکلات دیکھ کر کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر A.C. EWING نے کہا ہے۔ "اگر روسو عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربے سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا[2]"۔ اکثریت کی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے کے اس باطل نظریئے کے متعلق قرآنِ کریم نے یہی بات صدیوں پہلے کہہ دی تھی۔ کفارِ عرب سے کہہ دیا گیا کہ محض تمہاری تعداد کی کثرت کامیابی کی ضمانت نہیں[3]۔ اسی طرح جماعتِ موسیٰؑ تعداد میں کم ہونے کے باوجود لشکرِ فرعون کے مقابلے میں حق پر تھی[4]۔ اس کے علاوہ یہ کہا کہ "خبیث کی کثرت کتنی ہی تعجب انگیز ہو وہ طیّب کے برابر نہیں ہو سکتی[5]"۔ پس، عزیزانِ محفل! یہ نظریہ باطل ہے کہ بات وہ درست ہے جو اکثریت کہے اور اسی جواز پر وہ بات اقلیت کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اور جیسا کہ آپ نے دیکھا، جدید نظامِ جمہوریت میں، حقیقتاً ایسا ہوتا بھی نہیں کہ ہمیشہ اکثریت کی مرضی سے فیصلے ہوتے ہوں۔ زیادہ تر نظام ہائے جمہوری میں لوگوں کی عام اکثریت صرف اپنے نمائندے چننے میں حصہ دار رہتی ہے۔ اس کے بعد مجلسِ قانون ساز، مجلسِ مشاورت، انتظامیہ وغیرہ سب تمام فیصلے اپنی مرضی سے حاکموں کی ایک محدود تعداد میں رہ کر کرتے رہتے ہیں یہ اصل میں بادشاہت ہی ہے، وہی پرانی چیز۔ صرف اوپری لباس بدل دیا گیا ہے۔ خوبصورت اصطلاحوں اور دل خوش کن باتوں اور پرفریب نعروں سے چالاک حکمران طبقہ سادہ دل عوام کو فریب دیئے رہتا ہے اور معصوم انسان اسی کو سچائی سمجھے رہتے ہیں۔ ع

۱- "THE CRISIS OF CIVILISATION". پروفیسر الفریڈ کوبن — سلیم کے نام خطوط، غلام احمد پرویز

۲- "THE INDIVIDUAL, THE STATE & THE WORLD GOVERNMENT" پروفیسر اے سی ایونگ — جلد سوم خطوط، اسلام کا سیاسی نظام

۳- دیکھئے سورہ الانفال - آیت: ۱۹

۴ " " الشعراء - آیت: ۵۴۔ نیز سورہ الجن آیت: ۲۴

۵ " " المائدہ - آیت: ۱۰۰

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری[1]
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خوابِ آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں، قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو!

بانگِ درا خضرِ راہ۔ (سلطنت)

اخلاقیات کا مقام

نظامِ جمہوریت کے ان نقائص کے علاوہ ایک بڑی اہم چیز جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اب تک جن نظامہائے سیاسیہ پر ہم نے نظر ڈالی ہے اُن میں ایک قدرِ مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے اخلاق MORALITY کا معدوم ہونا یعنی ان تمام نظاموں میں سے کسی کی بھی بنیادوں میں اخلاقیات کا کچھ حصہ نہیں۔ جدید مغربی سیاست کے امام مشہور اطالوی مدبّر میکیاؤلی نے تو اس باب میں اخلاقیات کی تمام حدیں توڑ کر رکھ دیں۔ سولھویں صدی عیسوی کے اس مفکّر کی تصانیف، بالخصوص 'THE PRINCE' کا اثر موجودہ زمانے کی سیاست پر بہت گہرا ہے۔ اس چھوٹی سی، مگر دُور رس نتائج کی حامل تصنیف میں اُس نے حکمرانوں کے لئے جو ہدایات اور مشورے تحریر کئے ہیں وہ پڑھنے سے تعلّق رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ حکمران میں شیر کی سی قوت کے ساتھ ساتھ لومڑی کی سی چالاکی ہونا بھی ضروری ہے۔ حاکم ہر وقت چوکنّا رہے اور اپنے دشمنوں پر بغیر انتباہ کے جا پڑے اور دو جہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ان کی دائمی بیخ کنی کے لئے مکمل طور پر انہیں تباہ و برباد کر دے۔ میکیاؤلی کے نزدیک ریاست کی سلامتی اور بڑھوتری (EXPANSION) وہ چیزیں ہیں جو ہر شے پر تقدّم اور ترجیح رکھتی ہیں اس لئے حاکم کو سب کچھ کرنے کا اختیار ہے اور اس لئے حکمرانوں کو کوئی مذہب رکھنا ضروری نہیں اور حکمران اخلاقیات سے ماورا ہوتے ہیں[2]۔ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت کے مروّجہ اخلاق کے درس یعنی دوسرا گال بھی سامنے کر دو

۱۔ اور سب سے بڑھ کر یہ مشہور سادہ مگر پُرکار شعر۔ ع

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!

۲۔ دیکھئے۔ THE PRINCE by NICOLO MICHIAVELLI

"PRINCES DON'T NEED TO KEEP FAITH & AND ARE BEYOND MORALITY."

وغیرہ) یورپ کو راس نہ آئے اس لئے سیاست میں سے اخلاقیات کو دانستہ "دیس نکالا" دے دیا گیا۔ سیاست اور اخلاق کی اس لاتعلقی کا تو خود اہلِ مغرب اعتراف کرتے ہیں۔ R.H.TAWNEY نے لکھا ہے کہ "سیاسی حساب کتاب کا یہ نیا عمل (جو) پہلے جھجک کر اور پھر خود اعتمادی سے یہ کہتا ہے کہ (ریاستی) قانون سے ماوراء کوئی اخلاقی ضابطہ قانون نہیں رکھتا۔" بات دراصل یہی ہے کہ نظام کوئی بھی ہو چاہے شخصی (حکومت) ہو یا عوامی (جمہوریت)، جب تک اس کی عمارت اخلاق اور مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) پر قائم نہیں ہو گی، انسان انسان کا استحصال کرتا ہی رہے گا۔ شکل چاہے کچھ بھی ہو جائے، اصل وہی رہے گی۔ جمہوریت ایک دلفریب پردہ ہے جس کے پیچھے چند لوگ بادشاہت کرتے ہیں۔ یہ لوگ بیشتر حالات میں مذہب کے اجارہ دار یعنی پیشوا اور گروہِ دولتمنداں یعنی سرمایہ دار، جاگیردار وغیرہ ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ آج کی دنیا میں سرمایہ داری اور جمہوری سیاست کا سب سے بڑا گہوارہ ہے۔ وہاں بڑے بڑے صنعتی ادارے جس طرح ملکی معاملات (اور امریکہ کے بہت بڑی طاقت ہونے کے نتیجہ میں دنیا کے بیشتر ممالک کے معاملات) پر اثرانداز ہوتے ہیں، وہ صاحبانِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ بقول شخصے جس چیز میں جنرل موٹرز کمپنی کا فائدہ ہو وہی امریکہ کی پولیسی قرار پاتی ہے۔ 'WHAT IS GOOD FOR GENERAL MOTORS IS GOOD ENOUGH FOR AMERICA' ۔ یہ بڑے بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار پردوں کے پیچھے بیٹھے تار ہلاتے ہیں اور پردوں کے سامنے اپنے پروردہ سیاستدانوں سے کام لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ سابق امریکی صدر لنڈن جانسن آنجہانی نے سرمایہ دار نمائندوں کے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں اپنی روایتی جنوبی ریاستوں والی عادت کے مطابق برملا کہہ دیا تھا کہ "ہم لوگ یعنی عمّالِ حکومت) وہی کام کر رہے ہیں جس کے لئے آپ لوگوں نے ہمیں ملازم رکھا ہوا ہے۔"[2] یہی بادشاہ گر، آج کے اصل حکمران ہیں۔ ان سرمایہ داروں کا تو دین و ایمان منافع ہوتا ہی ہے، ان کے پروردہ سیاستدان بھی قول و فعل کے تضاد کے مارے ہوتے ہیں۔ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ اور ہیں کیونکہ یہ لوگ دوغلی زندگی میں یقین رکھتے ہیں اور اخلاقیات کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ دل خوش کن نعروں، دلفریب الفاظ و تراکیب اور مسحور کن باتوں سے سادہ دل لوگوں کو ورغلا کر اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں اور انہیں اپنی مرضی پر چلاتے ہیں۔ فرانسیسی مفکر رینی گوئن RENE GUENN

۱۔ RELIGION AND THE RISE OF CAPITALISM by TAWNEY - PAGE: 24

۲۔ شاہراہِ انقلاب۔ مبشر حسن۔ ٹمپل روڈ، لاہور۔

لکھتا ہے۔ ....۔ "عام رائے دہندگی کا اصول (اسی فریب دہی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ (اس اصول کی رُو سے) سمجھا یا جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے"۔ ......[1] اسی باطل روش کے علمبردار اور پیروکار اہلِ سیاست ہیں جو سادہ دل عوام کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ کہیں جاگیردار، مزارعوں کے ہمدرد بن کر آتے ہیں، کہیں مساوات کے دشمن برابری کا پرچار کرتے ہوئے آتے ہیں، کہیں سرمایہ دار، مزدوروں کی حمایت میں پرچم بلند کئے آتے ہیں اور کہیں مستبد اور ظالم مطلق العنان حاکم (DICTATORS) جمہوری نمائندوں کا لبادہ اوڑھے چلے آتے ہیں۔ ان کے بغل میں چھری اور منہ میں رام رام، ہوتا ہے بڑی بڑی باتیں اور لمبے اونچے وعدے کرتے ہیں لیکن جب اقتدار مل جاتا ہے تو خلقِ خدا کا استحصال کرنے لگتے ہیں۔[2] اقبالؒ نے اس تلخ حقیقت کو ابلیس کے ایک مشیر کی زبانی یوں بیان کیا ہے[3] ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس — جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو! — ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟ — چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اور اس میں مزے کی بات یہ ہے، کہ ان کی جھوٹی باتوں PROPAGANDA کے اثر سے سادہ لوح انسان اسی قفس کو آشیاں اور اسی شرابِ رنگ و بو کو گلستان سمجھے رہتے ہیں۔ حاکموں کا طریقِ کار ہی کچھ ایسا پُرفریب ہوتا ہے[4] ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الملوک[5] — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری!

جمہوریت کے علمبرداروں کا یہ دعویٰ کہ ہر آدمی کو محض کاغذ کی ایک پرچی 'VOTE' استعمال کرنے کا حق دینے

۱- "THE CRISIS OF THE MODERN WORLD"۔ بحوالہ سلیم کے نام خطوط (پرویزؒ) جلد سوم ص ۵۰۔
۲- دیکھئے سورہ البقرۃ کی آیات ۲۰۴ اور ۲۰۵
۳- ارمغانِ حجاز۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ "پہلا مشیر"۔
۴- بانگِ درا۔ خضرِ راہ "سلطنت"
۵- سورہ النمل آیت ۳۴۔ حضرت سلیمانؑ کے لشکر کی آمد کی خبر سُن کر ملکہ سبا نے کہا کہ ملوک (بادشاہ) جس ملک میں جاتے ہیں اُسے تباہ کر دیتے ہیں۔

سے سب کا درجہ برابر ہوجاتا ہے، ایک جھوٹ اور ایک بہت بڑے فریب سے زیادہ کچھ نہیں! ع

یہ علم یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت - پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات[1]

یہ ہے حقیقت اِن نظام ہائے سیاسیہ اور ان کے بنیادی فلسفوں کی اچلتے چلتے اجازت

سوشلزم

دیجئے کہ چند باتیں اس نظام کے متعلق ہوں جس نے آج تقریباً آدھی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے - روس، چین اور متعدد یورپی ممالک میں رائج نظام اشتراکیت (COMMUNISM) کی بنیادیں فلسفہ سوشلزم (SOCIALISM) میں پائی جاتی ہیں کمیونزم دراصل سوشلزم ہی کی بڑھی ہوئی (یا انتہائی) شکل ہے۔ اس فلسفہ کا زیادہ تعلق تو معاشی انتظام سے ہے [2] لیکن اس کا فلسفہ اور نظریہ سیاسی لحاظ سے بھی ایک نظر دیکھ لینے کا مستحق ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عوام کی فلاح و بہبود اور اقتدار کا سرچشمہ عوام کے پاس ہونا وغیرہ قسم کے تصورات قدیم سے چلے آرہے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ایرانی شخصیت حضرت زرتشت کے شاگرد رشید جناب مزدک غالباً سب سے پہلے کمیونسٹ لیڈر تھے انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود پر زور دیا لیکن ان کا فلسفہ جناب زرتشت کے تتبع میں روشنی و تاریکی (یزداں و اہرمن) کی ثنویت کا تھا۔ اسی فلسفے اور عوامی نظریے کی بنیادیں ارسطو اور افلاطون کے حاکم و محکوم والے نظریئے میں پائی جاتی ہیں۔ حالیہ زمانے میں جرمن فلسفی ہیگل (HEGEL) نے بھی اسی بنیاد پر اپنے فلسفے کی عمارت اٹھائی اور کہا کہ اس کائنات میں تصورات (IDEAS) کی جنگ چل رہی ہے۔ ایک تصور کچھ عرصہ چلتا ہے پھر اسی میں سے اس کی ضد ایک تصور پیدا ہوتا ہے۔ اب ان دونوں تصورات کی کشمکش کے

ہیگل اور مارکس کا نظریۂ اضداد

نتیجے میں ان ہی میں سے ایک تیسرا تصور ابھرتا ہے جو ان دونوں کی ملی جلی خصوصیات لئے ہوتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ آگے چلتا

۱- بالِ جبریل - نظم لینن

۲- M. RODINSON نے ISLAM & CAPITALISM P:22 مصنف کے مطابق رسول اللہ صلعم کی ولادت کے وقت پڑوسی ملک ایران میں خسرو اوّل المعروف بہ نوشیروانِ عادل اپنے باپ کی سپردی میں اپنے ملک میں جناب مزدک کی سوشلسٹ تعلیمات کو بہت حد تک رائج کر چکا تھا یہ حقیقت اور اسلام کی تعلیمات بہ سلسلہ ملکیت کی آپس میں مشابہت مصنف کے نزدیک اہم اور معنی خیز ہے۔

حضورؐ نے نوشیروان عادل کی تعریف فرمائی ہے، یہ بھی احادیث میں ملتا ہے - دیکھئے مقالات سرسید احمد خاں حصہ نہم - ص: ۲۰ -

رہتا ہے۔ اس سلسلے کا محرک وہ روحِ عصر، SPIRIT OF THE AGE کو قرار دیتا ہے۔ بعد میں مشہور فلسفی کارل مارکس KARL MARK نے یہی بات کہی لیکن تصور کی جگہ معاشیات (ECONOMY) کا لفظ استعمال کیا اور محرک تاریخی وجوب 'HISTORICAL NECESSITIES' کو قرار دیا۔ اس جرمن یہودی کے خیال میں نوعِ انسان کی ساری تاریخ معاشی کشمکش یعنی رزق کے جھگڑے یا روٹی کی لڑائی کی کہانی ہے۔ اور یہ کشمکش اور اس کے نتیجے میں اضداد کا ڈوبنا، اُبھرنا ایک تاریخی ضرورت ہے یعنی اسے بہرحال ہونا ہی ہے۔ اسی چیز کو بنیاد بنا کر روس میں لینن (LENIN) کی سرکردگی میں اس صدی کے اوائل میں عوامی انقلاب برپا کیا گیا۔ ہمارے زمانے میں ایک اور پُراثر مزدکی (سوشلسٹ) شخصیت ماؤزے تنگ (MAO TSE TUNG) کی ابھی ابھی وفات ہوئی ہے اس کا فلسفہ اضداد ہیگل اور مارکس دونوں سے مختلف تھا اس کے خیال میں کائنات کی ہر شے میں دو متضاد عناصر ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ اس جنگ میں کبھی ایک عنصر غالب رہتا ہے، کبھی دوسرا قرآن کریم کا نظریۂ اضداد

قرآنی اضداد

ان سب سے الگ ہے۔ اُس کے مطابق اس کائنات میں ہر جگہ اور ہر وقت اور ہمیشہ سے متضاد اشیاء برسرِ پیکار ہیں۔ مثلاً روشنی و تاریکی، علم و جہالت، حق و باطل، سچ و جھوٹ وغیرہ [۱] لیکن اس کشمکش میں ہمیشہ حق غالب رہتا ہے [۲] اور یہ کہ یہ اضداد الگ الگ خداؤں کے نہیں، ایک ہی خدائے واحد و لاشریک کے پیدا کردہ ہیں۔ بہرکیف کارل مارکس اپنے زمانے کے نہ صرف معاشی بلکہ سیاسی نظام سے مطمئن نہ تھا۔ یہ کہتا ہے "سیاسی طاقت جسے کہا جاتا ہے، یہ صرف ایک طبقے کی دوسرے طبقے کی دبائے رکھنے کی منظّم طاقت ہے [۳]" اُسے اُمید تھی کہ "جب ترقی کی راہ میں طبقاتی اُونچ نیچ بالکل ختم ہو جائے اور جب تمام پیداوار پوری قوم کی وسیع تنظیم کے ہاتھ میں آجائے تو پھر حکومت کی طاقت کی سیاسی نوعیت ختم ہو جائے گی" [۳] لیکن کیا اب تک ایسا ہوسکا ہے اور اشتراکی سیاسی نظام اپنے دعوے اور وعدے پورے کرسکا ہے؟ یقیناً نہیں! اشتراکی نظریئے (مزدکیت) کی ان خامیوں کے باوجود بنیادی طور پر یہ فلسفہ دیگر سیاسی نظریات کی نسبت، قرآن کریم سے زیادہ قریب ہے۔ اور

۱۔ "ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ۔ چراغِ مُصطفوی سے شرارِ بولہبی"

۲۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝ (بنی اسرائیل : ۸۱)

نیز دیکھئے ، (الانبیاء : ۱۸) اور (سبا : ۴۸)

۳۔ مقالہ، اشتراکیت اور معاشی ترقی از حسین احمد خاں۔ حوالہ از کارل مارکس کا منشورِ اشتراکیت THE COMMUNISTS MANIFESTO

۴۔ جریدہ چراغِ راہ، (سوشلزم نمبر)۔

انسانی معاشرے کے روایتی استحصالی مترفین کو اس میں اپنی موت نظر آتی ہے اور وہ اپنے شیطانی کاروبار کو خطرے میں دیکھتے ہیں۔ اسی لئے سرمایہ داری اور جاگیرداری اور اسی طرح کے دیگر لوٹ کھسوٹ والے نظاموں کے حامی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس عوامی نظریئے کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے فلسفیوں اور اُن کے خیالات میں کیڑے نکالتے ہیں۔ اقبالؒ کی کتاب ارمغانِ حجاز میں 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کے عنوان سے نظم میں تیسرا مشیر انہی خطرات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب — ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیم بے تجلّی! وہ مسیحِ بے صلیب! — نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز — مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب!
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد — توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب!

اور اس کے جواب میں ابلیس دریا کو کوزہ میں بند کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سُناتا ہے ؎

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایّام ہے — مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

ان تمام چیزوں کے ساتھ، انسان کے خود تراشیدہ جن فلسفوں اور عقائد نے خود انسان کو نقصان پہنچایا ہے اُن میں ایک 'وطنیّت' ہے۔ یہ ایک ایسا غیر فطری عقیدہ ہے جس سے نسلِ انسانی مختلف گروہوں میں بٹ جاتی ہے اور جغرافیائی حد بندیوں کو وجۂ تفریق قرار دے کر نوعِ انسان خود اپنی ہی دشمن ہو جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ عقیدہ بہت شدّت سے اُبھرا ہے اور اسے کسی آسمانی صحیفے کی طرح درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے ایک زمانہ پہلے اس عقیدے کو غیر پسندیدہ اور غیر فطری قرار دے دیا تھا۔ "(تمام) انسان پہلے ایک ہی اُمّت (کے افراد) تھے۔ پھر (انہوں نے آپس میں) اختلاف کر لیا۔" (یونس: ۱۹)۔ انہی اختلافات کو مٹانے کے لئے انبیاءؑ مبعوث ہوئے (بقرۃ۔۲۱۳) نیز (الحدید: ۲۵)۔ کیونکہ انسانوں میں رنگ اور نسل وغیرہ کا فرق تو محض پہچان کے لئے ہے۔ باعثِ امتیاز کوئی چیز اگر ہے تو وہ صرف تقویٰ ہے (۴۹/۱۳ الحجرات)۔ یہ اختلافِ رنگ و زبان قوم اہلِ علم کے لئے (محض) نشانیاں ہیں (الروم: ۲۲)۔ تاریخِ عالم میں اس عقیدۂ وطنیت نے جس قدر تباہی مچائی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ زمین کے ذرا ذرا سے ٹکڑوں پر حد بندیاں کر کے انسان بزعمِ خود الگ الگ قومیں بن جاتے ہیں اور پھر مادرِ وطن (دھرتی ماتا) کی خدمت کرتے ہیں اور اس خدمت میں دوسرے انسانوں سے لڑتے جھگڑتے اور مرتے مارتے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ مشہور مفکر برٹرینڈ رسل (BERTRAND RUSSEL) نے اپنی کتاب

نیشنلزم

'WHY I AM NOT A CHRISTIAN' میں لکھا ہے "مذہبی توہم پرستی سے بھی زیادہ نقصان دہ توہم پرستی وطن کی ہے (یعنی) ایک (انسان) کی ذمہ داری اپنی حکومت کی طرف ہے اس کے علاوہ کسی کی طرف نہیں ہے۔ بے شک، یہ (عقیدہ) نہایت روشن خیال ذاتی مفاد کے بھی خلاف ہے کیونکہ وطن پرستی محض (حدیہ ہے کہ) جیتی ہوئی اقوام کو بھی کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی ہے[1]" اس خدمتِ وطن میں اخلاقیات کا جو حال ہوتا ہے وہ بھی اہلِ نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ نکولو میکیاولی کا ارشاد آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور مفکر ROME LLIN کے الفاظ یہ ہیں "مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیئے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی ضابطے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز ہے[2]" اسی لئے وال پول (WALPOLE) نے کہا تھا کہ نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو نہیں بچا سکتے کیونکہ "سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے[3]" کیونکہ "سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رُو سے طے نہیں پایا کرتے[4]" اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں عالمِ سیاست میں ثنویت کا اصول کارفرما ہے اسلئے سیاستدانوں کے دو چہرے ہوتے ہیں بلکہ اکثر وطن پرستوں کے ہو جاتے ہیں۔ نجی زندگی میں جو کام کبھی نہیں کیا جاتا وہی وطن کے لئے کر گزرا جاتا ہے۔ اس چیز کو اطالوی مدبر GOVOUR نے سمٹا کر ایک جملے میں یوں کہا ہے:
"اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں[5]"
جب فکرِ انسانی نے عقیدۂ وطنیت کی یہ تباہ کاریاں دیکھیں، تو اس سے پیچھا چھڑا کر کچھ اور سوچنا شروع کیا۔ موجودہ صدی کے شروع میں انسان نے صدیوں کے تجرباتِ تلخ کے بعد یہ محسوس کیا کہ کرۂ ارض پر آباد انسان کی تمام آبادی کو مل جل کر رہنا چاہیئے۔ اور اس طرح انٹرنیشنلزم کا تصور اُبھرا۔ پہلے لیگ آف نیشنز اور پھر (آج کل کے) ادارہ اقوامِ متحدہ U.N.O. کا قیام عمل میں آیا۔ انسان نے سوچا تھا کہ شاید اب اُس

۱۔ دیکھئے اس کتاب میں مضمون 'WHAT I BELIEVE' میں حصہ اخلاقی اصول۔

۲۔ QUOTED BY MURRAY in 'THE INDIVIDUAL & THE STATE'

۳۔ ۴۔ QUOTED BY SUSAN STEBBINGS in "IDEAS & ILLUSIONS"

۵۔ "FOREIGN AFFAIRS" YEAR 1952

بین الاقوامیت

کی گم گشتہ جنت مل گئی، لیکن وائے حسرت! ہنوز دلی دور است کے مصداق انسان کا یہ خواب بین الاقوامیت سے بھی پورا نہیں ہوا ہے۔ استحصالی حکمران اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے کے نمائندے اگر مل بیٹھیں تو اس سے عالم گیر برادری وجود میں آجائے گی؟ عالمی بھائی چارہ قائم ہو جائے گا؟ یہ استحصالی آپس میں گٹھ جوڑ کر کے (وقتی طور پر) ایک دوسرے کے دوست تو ہو سکتے ہیں لیکن انسانوں کی غالب اکثریت کے دوست کیسے ہو سکتے ہیں؟ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ جو لوگ ذرا بھی حالاتِ حاضرہ سے واقف رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے بین الاقوامی ادارے ایک مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ برٹرینڈ رسل نے تو تنگ آکر یہ تجویز پیش کر دی کہ تمام زمین پر ایک ہی حکومت (کا انتظام) ہونا چاہیے[۲] یہی پکار قرآن کی تھی جب اُس نے کہا تھا کہ: جنہیں ملانے کا حکم خدا نے دیا ہے انہیں ٹکڑے ٹکڑے مت کرو ـــــ (بقرۃ: ۲۷) نیز (الرعد: ۲۱، ۲۵) اس کی غیر فطری تقسیم سے مخلوقِ خدا اقوام میں بٹتی ہے اور اسلام کی جڑ کٹتی ہے۔ اس طرزِ زندگی سے انسان کے حالات بہت تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ چین و سکون کی جنت سے نکل کر خوف و حزن و اضطراب کے جہنم میں جا گرتا ہے ع

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

(بانگِ درا: تصویرِ درد)

فکرِ انسانی کا قافلہ ہنوز یہیں تک پہنچا ہے۔ ہزاروں سال سے انسان انہی پیچ و خم میں سرگرداں اپنی کھوئی ہوئی جنت کو تلاش کر رہا ہے۔ دُکھی انسانیت چاہتی ہے کہ کوئی ایسا نظام ہو جو اس کے مصائب دُور اور مشکلات حل کر سکے۔ اپنے طور پر سوچتے سوچتے اور تجربے کرتے کرتے انسان نے ایک بات ضرور محسوس کر لی ہے کہ نظامِ زندگی (جس میں نظامِ سیاست شامل ہے) کی اساس ہر دم بدلتے اصول (نظریۂ ضرورت) پر نہیں بلکہ چند مستقل پیمانوں پر ہونا چاہیئے۔ پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:-

"اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے۔ بنا بریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ معاشرے کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے ـــــ"

"GUIDE TO PHILOSOPHY OF MORALS & POLITICS"

آیئے اب ہم دیکھیں کہ ابدی ہونے کی دعویدار یہ کتابِ عظیم یعنی قرآنِ حکیم و کریم انسان کیلئے کیا سیاسی نظام تجویز کرتی ہے

۱۔ "ON EDUCATION" از برٹرینڈ رسل

۲۔ بحوالہ سلیم کے نام خطوط۔ جلد سوم۔ خط ۱۴

اس مضمون کا دوسرا حصہ اِلّا اللہ انشاء اللہ اگلی اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

محترم پرویز صاحب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قیامِ دین کا مفہوم

وحی کی غایت کیا تھی؟ قرآن کریم نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی "قیامِ دین"۔ اس نظامِ زندگی کا قیام جس میں انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ ۴۲/۱۳

"اے افرادِ نسلِ انسانی! خدا نے تمہارے لئے وہ نظامِ زندگی تجویز کیا ہے (جو کوئی نیا نظام نہیں ہے بلکہ اب سے بہت پہلے) جس کی نوحؑ کو بھی ہدایت کی جا چکی ہے اور جس کی (اے پیغمبرِ اسلامؐ! اب) ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں اور تم سے پہلے اسی نظام کو قائم کرنے کی) ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ کو بھی ہدایت فرمائی تھی۔ (وہ ہدایت کیا ہے؟) یہی کہ۔ (وحی کے متعین فرمودہ) نظامِ زندگی کو قائم کرو اور پھر (یکدلی کے ساتھ اس پر جم جاؤ یعنی) اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرو۔ (اے پیغمبرِ اسلامؐ) مشرکین پر اس نظامِ زندگی کا قیام جس کی طرف تم انہیں بلا رہے ہو بڑا ہی گراں گذر رہا ہے (مگر تم اس کی فکر نہ کرو۔ کیونکہ) خدا صرف انہی لوگوں کو اس سے نوازتا ہے جو اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انہی لوگوں کو صحیح راستہ دکھاتا ہے جو اپنے ارادہ اور عزم سے) اس کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔"

اوپر کی آیت کے اس ٹکڑے پر پھر غور کیجئے کہ اس نظام کا قیام "مشرکین" پر گراں گزرتا ہے اس لئے کہ وہ خدا کے سوا اوروں کا بھی یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کے لئے نظام وضع کریں۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ (۴۲/۲۱)

"کیا ان کے کچھ ایسے ساتھی بھی ہیں جنہوں نے (اپنی مرضی سے) ان کے لئے کوئی نظام زندگی تجویز کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی؟ (یقیناً ایسا ہی ہے)"

اس نظام زندگی کی تفاصیل طویل ہیں، لیکن اس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ خدا کے سوا، دنیا میں کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منوائے، نہ ہی کسی انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی انسان کو اپنا حکمران تسلیم کرے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور محکومیت صرف اسی کی اختیار کی جا سکتی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ سے یہی مراد ہے۔ خدا کی یہ حکومت، اس کے قوانین کی کارفرمائی کا نام ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اسلامی نظام مملکت، ان احکام و قوانین کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ یہ نظام مملکت، سب سے پہلے رسول کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔ رسول، خود بھی قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہے اور دوسروں سے بھی انہی کا اتباع کراتا ہے۔

اس نظام کا دوسرا گوشہ یہ ہے کہ رزق کے سرچشموں پر کسی کی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں خدا نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ دیا ہے۔ نظامِ اسلامی کا فریضہ یہ ہے کہ ان کا اسطرح

۱ے ایک قسم کے مشرکین تو مشرکین مکہ تھے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے لیکن دوسری قسم کے مشرک وہ ہیں جو ایمان لانے کے بعد شرک کرتے ہیں اور وہ ہیں جو قرآن کریم کے الفاظ میں وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ ... ٥ دیکھنا (تم ایمان لانے کے بعد پھر سے شرک کا ارتکاب نہ کر بیٹھنا یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور بہت سے گروہ ہو گئے"۔ اس کے بعد ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ) ان میں سے ہر ایک اپنے سوا ہر دوسرے کو گمراہ سمجھتا ہے اور) جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے (یعنی اپنے طریقے پر) اسی پر نازاں رہتے ہیں (کہ بس ہم ہی راہِ ہدایت میں ہیں) كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ٥ ۳۰/۳۱-۳۲

انتظام کرے کہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں۔
اس سے ظاہر ہے کہ اس نظام کی مخالفت کیوں ہوتی ہے؟

اربابِ اقتدار کی مخالفت

اربابِ حکومت اس کی مخالفت کرتے ہیں کہ اس نظام کی رُو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں رہتا کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ وہ حکومت و اقتدار کے تمام خزانوں کی کنجیاں اُن سے چھین کر، حکومت و اقتدار کے حقیقی مالک کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

اربابِ دولت و ثروت اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ اس نظام کی رُو سے سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اربابِ مذہب اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ یہ انہیں ان کی "خدائی مسندوں" سے نیچے اُتار دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک بندے اور خدا کے درمیان کسی انسانی وسیلہ کی ضرورت ہی نہیں۔

اربابِ طریقت مخالفت کرتے ہیں کہ یہ انہیں ان کی خانقاہوں کی خلوتوں سے نکال کر میدانِ عمل میں لاتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک یہ انسان کی سب سے بڑی شکست ہے کہ وہ باطل کی قوتوں کو کھلا چھوڑ کر خود گوشوں اور زاویوں میں جا چھپے۔

اربابِ حسب و نسب مخالفت کرتے ہیں کہ وہ پیدائش کی رُو سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک تمام انسانوں کی تخلیق "نفسِ واحدہ" سے ہوئی ہے۔

یہی ہیں وہ "ارباب" جنہیں قرآن اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ قرار دیتا ہے۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ط ۱۴/۳۰

"اور (دیکھو) لوگوں نے اللہ کے لئے بہت سے اس کے ہم درجہ گھڑ رکھے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو اس کی راہ سے بھٹکائیں۔"

ان میں سے ہر ایک کی طرف سے مخالفت ہوتی ہے۔ اور ان میں کتنے ہی باہمی اختلافات کیوں نہ ہوں، اس مخالفت میں سب ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں۔

پیغامِ توحید

رسول اللہ ﷺ بھی اسی نظام کا قیام چاہتے تھے اس لئے تمام "اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کی طرف سے اس کی مخالفت ضروری تھی۔ آپؐ کا پیغام یہ تھا کہ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

قُلْ اِنَّمَآ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۲۱/۱۰۸﴾

"اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو کہ مجھ پر جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ تمہارا حاکم ایک ہی تنہا حاکم ہے (اس کے سوا کوئی نہیں) پس بتاؤ، تم اس کے قوانین کے سامنے سر جھکاتے ہو یا نہیں؟"

آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ محکومیت خالصۃً اللہ کے قوانین کی ہو گی۔ اس میں کسی اور کی محکومیت کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ﴿﴾ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۹/۱۵-۱۹﴾

"(اے پیغمبر اسلام!) ان مخاطبین دعوت حق سے کہدے کہ میں تو اپنے نظام زندگی کو خالص (قانون خداوندی کے تابع) کرتے ہوئے اللہ ہی کی اطاعت و محکومیت اختیار کرتا ہوں (اگر تم کسی طرح بھی نہیں مانتے) تو خدا کے سوا جس کی تمہارا جی چاہے محکومیت واطاعت) اختیار کر لو (اور اسکا خمیازہ بھی بھگتو)

جنہیں تم نے ارباب قوت واقتدار سمجھ رکھا ہے، میں ان میں سے کسی کے حق حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ؗ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۰/۶۶﴾

"(اے پیغمبر اسلام) کہدے کہ مجھے (میرے خدا کی طرف سے) منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبودیت (محکومیت واطاعت) تسلیم کروں جنہیں تم لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہو (خصوصاً) جبکہ میرے پاس اس باب میں میرے پروردگار کی طرف سے کھلی کھلی دلیلیں بھی آچکی ہیں اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں (اپنی ہر حرکت اور عمل میں) تمام جہانوں کے پروردگار کے قوانین کی اطاعت کروں۔"

(اقتباس معراج انسانیت از محترم پرویز صاحب ص۱۳۹ تا ص۱۴۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب المراسلات

حیدرآباد میں وحشیانہ قتلِ عام

جمعہ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ½-۷ سے ۸ بجے تک حیدرآباد کے تقریباً ۵۰ جگہوں پر جہاں عام طور پر زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہوتے ہیں بیک وقت تقریباً ایک درجن گاڑیوں میں سے خودکار اسلحوں سے راکٹوں سے بے گناہ مردوں اور عورتوں اور بچوں پر بلا امتیاز زبان و نسل وحشیانہ قتلِ عام کا بازار گرم رہا۔

اہلیانِ شہر نے دھماکوں کی اور گولیوں جو آگ کی بارش کی طرح برس رہی تھیں آوازیں اور اُنکے ساتھ ہی مظلوموں کی چیخ و پکار سُنیں۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ پولیس شہر سے غائب تھا لوں میں تھی۔ انتظامیہ کے لوگوں سے ٹیلیفون پر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ راہ گیروں نے بتایا کہ ایک علیحدگی پسند تحریک (تنظیم) کی جانب سے حملہ ہوا ہے اور بہت سے لوگ مارے گئے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی وژن نے دبی دبی خبریں دینا شروع کیں۔ تخریب کاروں نے حیدرآباد میں لوگوں کو چوراہوں پر ہوٹلوں اور دوکانوں پر بربریت کا نشانہ بنایا اخبارات نے کچھ مزید تفصیل دی۔ دو ڈاکوؤں کے پکڑے جانے کی اطلاع بھی دی۔ اِن کا تعلق بھی اسی تنظیم سے بتایا گیا۔ نام بھی دیئے گئے مگر حکومت کی جانب سے کوئی مصدقہ خبر نہیں تھی۔ حکومت نے اتنا ضرور بتایا کہ کراچی میں اس کے ردِّ عمل کے طور پر تقریباً ۱۰۰ سے زائد افراد کو وحشیانہ طور پر قتل کر دیا گیا۔ حیدرآباد میں مقتولین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ سے زائد ہو گئی تھی۔ چوراہوں کے علاوہ حیدرآباد کے میئر جناب آفتاب احمد شیخ کے گھر پر بھی حملہ کیا گیا اور وہاں پر موجود پولیس گارڈ ہی نے ان دو افراد کو پکڑا تھا۔

اس اندوہناک سانحہ پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ بھائی نے بھائی کا خون کیا۔ نفرتوں کا ایک طوفان تھا۔ دنیا کی تاریخ میں اس نوعیت کا واقعہ آج تک نہیں ہوا ہوگا۔ نہتے بے گناہ انسانوں کا یوں منصوبہ بندی کے تحت قتلِ عام کر دیا گیا اور بوڑھے والدین بے سہارا ہو گئے عورتیں بیوہ ہو گئیں اور بچے یتیم ہو گئے۔ یہ سب کچھ وہاں ہوا جو مسلمانوں کا ملک کہلاتا ہے۔

اللہ کے احکام کی فرمانبرداری کے دعوے دار لوگوں کا یہ عمل کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ تو صاف

صاف منافقت ہے۔ قرآن کو چھوڑ دینے اور اللہ کے سوا دوسروں کے احکامات پر چلنے کا یہی انجام ہوتا ہے یہی تباہی ہے، عذاب ہے، جس کے بارے میں قرآن میں بتایا گیا ہے جس سے بچنے کے لیئے قرآن میں تاکید کی گئی ہے۔ قرآن نے ناحق قتل وخوں سے منع کیا۔ سازشوں سے منع کیا، جانبداری سے منع کیا، فساد پھیلانے سے منع کیا، گروہوں میں تقسیم ہونے سے منع کیا۔

اپنے فرائض منصبی کو پورا کرنے کیلئے کہا گیا، اللہ کے احکامات پر چلنے کا حکم دیا، امر معروف ونہی منکر کا حکم دیا آپس میں بھائی چارہ اور اتحاد کا حکم دیا گیا اور اپنے جذبات اور سرداروں کے بجائے اللہ کے احکامات پر چلنے کا حکم دیا گیا۔ مگر جذبات سے مغلوب لوگوں نے بے گناہ لوگوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیئے اور کوئی انہیں نہ تو روکنے والا تھا نہ ہی سمجھانے والا تھا۔ قرآن نے غصہ پر قابو پانے کا حکم دیا۔ مگر قرآن کے دعوے داروں نے عمل نہیں کیا۔ نہ لوگوں میں احترام قانون تھا اور نہ ہی حکام کو اپنی ذمہ داری کا احساس۔

حکومت نے تخریب کاروں کے بارے میں کوئی تفصیلات نہیں دیں۔ ایم، کیو، ایم کہتی ہے یہ لوگ تخریب کار نہیں تھے۔ سندھ قومی اتحاد جس میں جیئے سندھ تحریک شامل ہے، کہتی ہے کہ سندھیوں پر غلط الزام لگایا گیا ہے حکومت سندھ کہتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ کن لوگوں نے کس کے حکم پر یہ کام کیا ہے اور پھر ردِ عمل کے طور پر کس کے حکم سے کس نے یہ کام کراچی میں کیا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی ریڈیو کی خبر ہے کہ دو یا تین دنوں میں ان لوگوں کو خصوصی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جناب صدر نے پانچ نئے آرڈیننس جاری کیئے ہیں۔ قوانین کو سخت تر بنا دیا ہے۔ پولیس کے ساتھ ساتھ فوج کو مقرر کیا ہے اور جدید اسلحہ اور گاڑیاں بھی دی ہیں۔

اللہ کرے کہ سندھ میں دہشت گردی اور فساد جلد ختم ہو۔ خوف وہراس کا دور دورہ ہے نہ زندگی میں سکون واطمینان ہے اور نہ ہی کاروبار ہو رہا ہے۔ خوف وحزن ہر طرف ہے۔ معاشرہ جہنم بن چکا ہے۔ ظلم کو ہمیشہ کے لیئے ختم کرنے کے سچے احساس سے معاشرہ میں سکون وخوشحالی پیدا کی جا سکتی ہے۔ انتظامیہ اور پولیس وفوج اگر عملی جدوجہد کو تیز کر کے حق وانصاف کو مدنظر رکھ کر مظالموں اور فسادیوں کو گرفتار کرے اور خودکار اسلحہ کو ضبط کرے تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نظری طور پر لوگوں کی اصلاح ہو۔ نوجوانوں کو عقل سے کام لینے کی تلقین کی جائے۔ علیحدگی پسند تحریک پر پابندی ہو۔ تعصب اور علاقہ پرستی کے رجحانات پر اچھی طرح قابو پایا جائے۔

لوگوں کو لاقانونیت پر آمادہ کرنے اور اشتعال انگیزیوں سے روکا جائے۔ قانون کی صحیح حکمرانی

اسلام کے زرّیں اصولوں اور نظریۂ پاکستان کی صحیح اور مؤثر تبلیغ ہو۔ لوگوں کو اپنے ذاتی یا برادری یا گروہی مفادات کے بجائے ملّی اور ملکی مفادات کو سامنے رکھنے کی حکیمانہ تعلیم و تبلیغ ہو۔ خالص قرآنی اصولوں کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ بغیر جانبداری کے حق و انصاف کی بات کی جائے اور سازشیوں خونیوں اور فسادیوں کو ثبوت اور دستاویزات کے ساتھ عدالت کے سامنے پیش کیا جائے۔

عام خیال یہ ہے کہ ان فسادات کی بنیاد جیئے سندھ تحریک اور ایم کیو ایم کے باہمی اختلافات ہیں۔ جن کی لپیٹ میں عام مہاجر اور سندھی لے لیے گئے ہیں۔ جیئے سندھ جو اب دوسری تنظیموں کے ساتھ مل کر سندھ قومی اتحاد بن چکی ہے پہلے تو سندھ دیش کی آزادی کی بات کرتی تھی مگر اب بظاہر اِس نعرے کو ترک کر چکی ہے اور سندھ کے حقوق کی بات کرتی ہے۔ کالا باغ ڈیم۔ سندھ فوجی چھاؤنیوں سندھ میں پنجابیوں کی آبادکاری کے خلاف اور اسکے اخراج کی حامی ہے۔ ۱۹۵۴ء کے بعد آنے والوں کو سندھی نہیں مانتی۔

ایم کیو۔ ایم مہاجروں کے حقوق کی بات کرتی ہے۔ تشدّد پسندی دونوں جماعتوں کا شعار معلوم دیتا ہے۔ دھمکیاں عام دی جاتی ہیں۔

پہلے پہل دونوں میں اشتراکِ عمل تھا۔ اختلاف ایک چوک کے نام رکھنے پر ہوا۔ بعد میں تصویریں لگانے پر ہوا۔ چوک پر مسلّح حملہ ہوا۔ قائداعظمؒ اور لیاقت علی خاں کی تصویروں پر کالک مل دی گئی۔ مسلّح تصادم الطاف حسین کی کوششوں سے ٹل گیا۔ نوجوانوں میں نفرتیں باقی رہیں۔ چھ سات بسیں بلدیہ حیدرآباد کے سامنے مظاہرہ یا حملہ کرنے آئیں۔ ہتھیاروں سے مسلّح افراد اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔ فائرنگ کا تبادلہ ہوا پھر سندھی مہاجر فساد پھیل گیا۔ اِس سے پہلے آفتاب شیخ کے مکان پر بم پھینکا گیا۔ جیئے سندھ کے کچھ آدمی گرفتار ہوئے۔

سُنا ہے کہ منسٹر کو دھمکیاں دی گئیں۔ بلدیہ پر حملہ ہوا۔ پولیس اور انتظامیہ نے کچھ بھی نہیں کیا ایس ایس پی نے کہا کہ وہ پُرامن تھے اور مظاہرہ کرنے آئے تھے۔ عدلیہ کی طرف سے تحقیقات شروع ہوئیں۔ نتیجہ ابھی سامنے نہیں آیا۔ اسی دوران آفتاب شیخ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ شدید زخمی ہوئے مگر ایک کونسلر مارا گیا۔ قاتل گرفتار ہوئے مقدمہ ابھی چل رہا ہے۔ جیئے سندھ والے ان کو چھڑانے کے لیے مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہیں۔ رشوت اور جانبداری نے انتظامیہ اور پولیس کو قابلِ اعتماد نہیں رکھا۔ حقیقت کیا ہے کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہر آدمی علم کے بجائے قیاس آرائی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ ذرائع علم ریڈیو، ٹیلی وژن اور حکّام خاموشی اور مصلحت سے کام لیتے ہیں۔ اسکے بعد موٹر سائیکلوں

پر سوار لوگوں نے فائرنگ کی ۔ یہ بھی ہوٹلوں اور دکانوں پر ہوئی ۔ مہاجر علاقہ اور وہاں کے لوگ انکا شکار تھے۔ رات کے ۱۱ بجے کے بعد گھروں سے نکلنے پر پابندی لگ گئی ۔ پھر یہ اندوہناک سانحہ ہؤا۔ صوبۂ پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے لوگ خاموش ہیں ۔ نہ اظہارِ خیال کرتے ہیں اور نہ کوئی دباؤ ڈالتے ہیں ۔

جناب صدر نے خود تسلیم کیا ہے کہ سابقہ حکومتوں نے مصلحت اور نرمی سے کام لیا ہے اور اس طرح علیحدگی پسند اور گروہی تنظیمیں پنپتی رہیں ۔ کوٹہ سسٹم رائج کیا گیا ۔

قرآن نے صلاحیت کی بنیاد پر داخلے اور نوکریاں دینے کا اصول دیا ۔ علم اور قوت حاکم کی خصوصیات بتائیں ۔ تقویٰ کا معیار مقرر کیا ۔ مگر صرف سندھ میں دیہاتی اور شہری کا الگ الگ کوٹہ مقرر کیا گیا۔ ضیاء صاحب کی اسلامی حکومت نے بھی اس کی توثیق کی ۔ ایک خاص تنظیم کے رُکن یا ہمدرد انتظامیہ کے اہل کار بنتے گئے ۔ تشدّد کا پرچار کھلے عام ہؤا ۔ جذبات بھڑکائے جاتے رہے ۔ پاکستان توڑنے کی باتیں ہوئیں ۔ کچھ لوگوں نے اِن پر مقدّمہ چلانے کا مطالبہ بھی کیا حکومت نے وعدہ بھی کیا مگر ہؤا کچھ بھی نہیں ۔ اسلحہ کھلے عام آتا رہا ۔ اس کا مظاہرہ بھی ہوتا رہا مگر انتظامیہ نے کچھ بھی نہیں کیا ۔ پاکستان کے لیڈروں اور عوام کو چاہیئے تھا کہ مظاہرے اور مطالبے کرتے مگر انہوں نے بھی مجموعی طور پر کچھ بھی نہیں کیا ۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کے اصولوں پر گامزن ہو کر ہر پاکستانی حق و انصاف کی بات کہے اور ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا پرزور مطالبہ کرے ۔ اور اس طرح سے اسلام اور نظریۂ پاکستان پر مکمل ایمان اور عمل صالح ہو ۔

سیّد حامد علی ۔ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام حیدرآباد

بقیہ حقائق و عبر از صفحہ ۸۰

کو اور بعثت ۹، ربیع الاول ۴۱ء میلادی مطابق ۱۲ فروری ۶۱۱ء کو بروز دوشنبہ روح الامین خدا کا حکم نبوت لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس وقت آپ غارِ حرا میں تھے ۔ اور وفات ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ یوم دوشنبہ وقت چاشت تھا کہ جسم اطہر سے روحِ انور نے پرواز کیا۔ اس وقت عمر مبارک ۶۳ سال قمری پر چار دن تھی۔

إنا لله و انا اليه راجعون

سیّد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک اور پاکیزہ زندگی اور سیرت مطہرہ نازک ترین مسئلہ ہے ۔ اس کے بیان میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے ۔

امید ہے ڈاکٹر اسرار احمد اپنے بیان پر نظرِ ثانی فرمائیں گے ۔ ڈاکٹر صاحب ایسے ذمہ دار حضرات سے اس قسم کی بے احتیاطی نہایت افسوسناک ہے ۔

(ایضاً صفحات ۳، ۱۹)

حقائق و عبر

۱۔ حنیفاں کے ابّا

فرقہ اہلحدیث کے مولوی حضرات اپنی نجی گفتگو میں حنفی فقہ کے بانی حضرت امام ابوحنیفہؒ کو "حنیفاں کے ابّا" کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان کے بعض نیم تعلیم یافتہ علماء اپنی تقریروں میں بھی امام صاحب کے لئے طنزیہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ انہی میں سے ایک صاحب عبدالرحمٰن یزدانی تھے جو اپنی تقریروں میں امام صاحب پر اس قسم کے طنز کے تیر برسا کر، انہیں جاہل ثابت کرتے، اور حاضرینِ جلسہ جو زیادہ تر اسی فرقے کے لوگ ہوتے، ان کی اس بدگوئی پر قہقہے لگاتے۔ کسی اہلِ حدیث عالمِ دین نے ان کی اس مذموم حرکت کی کبھی مذمّت نہ کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سب کے دل کی آواز تھی۔ چنانچہ حال ہی میں ایک اہلِ حدیث مولوی نے علمائے دیوبند کے ایک سرخیل عالمِ دین سیّد حامد میاں سے دینی مسائل پر گفتگو کی، تو میاں صاحب نے ان کے اس طرزِ عمل کی یوں شکایت کی۔

"ارشاد: (پروفیسر صاحب) "مولوی احسان الٰہی ظہیر کے ساتھ حادثے میں جاں بحق ہونے والے خطیبِ اعظم کا مونکی بھی "حنیفاں کے ابّا" کو اپنی تقریروں میں کوسا کرتے تھے۔ اور انہیں دین کے مسائل سمجھانے کی آرزوؤں ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور، بابت ۹ ستمبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۶)

متعلقہ اہلحدیث مولوی صاحب اپنے ان علّامہ کی اس حرکت کی یوں وضاحت کرتے ہیں:۔

"لے آئمہ کو کوسنے اور ان کی شان میں گستاخی کے الزام کی حقیقت کو ایک انتہائی سادہ سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک شخص مثلاً خالد کسی پہاڑ میں ۲۰ فٹ کی بلندی پر رہتا ہے اس کا ایک دوست زبردستی اسے ۳۰ فٹ کی بلندی تک لے جاتا ہے اس کا دوسرا دوست پوری کوشش کرتا ہے کہ اسے ۲۰ فٹ کی بلندی تک واپس اُتارا جائے۔ دونوں دوستوں کی اس کشمکش کے نتیجے میں خالد ۲۰ فٹ کی بلندی سے بھی قدرے نیچے اُتر جاتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس صورتِ حال کا اصل ذمّہ دار وہی شخص ہوگا جو خالد کو اس کے اصل

مقام سے بھی اونچا لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ اگر قوم ابراہیم بت سازی و بت پرستی نہ کرتی تو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بت شکنی کی کبھی ضرورت پیش نہ آتی۔"

(ایضاً صفحہ ۱۷)

الاعتصام فرقہ اہل حدیث کا سب سے زیادہ سنجیدہ اخبار ہے۔ اس عبارت کے ذریعے ان کا یہ سنجیدہ اخبار یہ ثابت کرتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مقام ہی پست تھا۔ لیکن حنفیوں نے ان کا مقام بلند کر کے خواہ مخواہ اہل حدیث حضرات کو انہیں گالیاں دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ خیال رہے کہ امام صاحب کے خلاف "اہل حدیث" یہ دشنام طرازی خود نہیں کر رہے بلکہ امام بخاریؒ کہ جن کی کتاب صحیح بخاری کو قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب سمجھا جاتا ہے، وہ امام صاحب کے لئے اس سے بھی زیادہ قبیح اور بُرے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ وہ اپنی ایک کتاب تاریخ صغیر میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کو سب سے بڑا جھوٹا راوی ثابت کرنے کیلئے تحریر فرماتے ہیں:۔

مَا وُلِدَ فِي الْإِسْلَامِ أَشْأَمُ مِنْهُ

ترجمہ: اسلام میں (حضرت امام ابو حنیفہؒ) سے زیادہ بدبخت انسان پیدا ہی نہیں ہوا۔ (نعوذ باللہ نقل کفر، کفر نہ باشد)

(التاریخ الصغیر از امام بخاری شائع کردہ ادارہ ترجمان السنہ لاہور ص ۱۷۱)

اسلام تو دشمنوں کے خلاف بدزبانی کی اجازت نہیں دیتا اور ہمارے اہلحدیث بھائی اور ان کے امام حضرت ابو حنیفہؒ کے خلاف ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاسقانہ اور منافقانہ قرار دیا ہے۔ رسول اللہ نے منافق کی جو چار برائیاں گنائی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ کہ جب وہ جھگڑا کرتا ہے تو بکواس کرتا ہے۔ اہل حدیث حضرات کو اس ارشاد نبویؐ کی روشنی میں اپنا مقام خود متعین کر لینا چاہئے۔ ویسے ہمارا یہ دعوےٰ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ آجکل کے جاہل اہلحدیث علماء سے زیادہ متبع حدیث تھے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمینداری نظام کو سود قرار دیا تو امام ابو حنیفہؒ نے بھی اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا۔ لیکن اہلحدیث ان سچی احادیث کا انکار کرتے ہیں اور اسطرح غیر حاضر زمیندار حضرات جو کروڑوں غریب کسانوں کا استحصال کر رہے ہیں اس کا جواز ثابت کرتے ہیں۔

۲۔ جنتی تعویز

علمائے دیوبند کے ایک ماہنامہ البینات کراچی میں پچھلے کئی ماہ سے ایک اشتہار شائع ہو رہا ہے۔

جس کا متن یہ ہے۔

زچہ بچہ کی حفاظت و سہولت کے لئے ایک نہایت معتبر جنتی تعویز۔

"محدثِ اعظم علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ تصانیف کثیرہ و تفسیر درِ منثور وغیرہ نے اپنی کتاب کفایۃ الطالب اللبیب فی خصائص الحبیب (ج ۱ صہ ۴۲) پر درج کرتے ہیں کہ ابو نعیم نے بہ حدیث حضرت بریدہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا کہ دونوں کہتے ہیں کہ حضرت آمنہ حضورؐ کی والدہ نے خواب میں دیکھا کہ انہیں کہا گیا کہ آپ کو حمل ہوا ہے۔ ساری مخلوق سے بہترین اور کل جہانوں کے سردار جب وہ آپ سے پیدا ہوں تو آپ ان کا نام احمد و محمد رکھیں اور ان پر یہ تعویذ لگا دیں۔ جب جاگ اٹھیں تو دیکھا ان کے سرہانے کے قریب ایک سونے کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ جس پر یہ تعویذ لکھا تھا (اس وقت سونے کا برتن حرام نہ تھا) جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حجرِ اسود جنت سے سفید پتھر نازل ہوا تھا۔ لوگوں کے گناہوں نے اس کو سیاہ کر دیا۔ معلوم ہوا جنتی پتھر میں گناہوں کو جذب کرنے کا خاصہ تھا اور یوسف علیہ السلام نے جنت کا قمیص جب والد صاحب کے منہ پر لگوایا تو وہ بینا ہو گئے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ کا مینڈھا جنت سے آیا تھا۔ اس کے سینگ کعبہ شریف میں مدتوں رکھے رہے۔ آپ بھی اس جنتی تعویذ کی برکتیں حاصل کریں۔ اپنے پتہ کا ڈاک لفافہ اور خرچہ اشاعت میں ایک روپیہ کا ٹکٹ بھیج کر منگوالیں"۔

(مفتی جمیل احمد تھانوی مدظلہم جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور پاکستان)

بینات ماہ شوال ذوالقعدہ ذوالحجہ ۱۴۰۸ھ

جون جولائی اگست

(ہفت روزہ الاعتصام بابت ۱۶ ستمبر ۱۹۸۸ء صہ ۱۳)

قرآن مجید انسانیت کی فلاح کے لئے نازل کیا گیا تھا۔ ہمارے علماء کے نزدیک انسانیت کی فلاح سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت ان کے اس اشتہار سے ہوتی ہے۔ یہ اشتہار دینے والے کوئی جاہل ملا نہیں بلکہ علمائے دیوبند کے سرخیل اور جامعہ اشرفیہ لاہور کے اجل اساتذہ کرام میں سے ہیں۔ یہ حضرات اپنے پیٹ کے لئے کس طرح اسلام فروشی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ہفت روزہ الاعتصام کہ جس سے یہ اشتہار نقل کیا گیا ہے، اس نے تعویذوں کے بارے میں تمام روایات کو جھوٹا ثابت کیا ہے۔ لیکن خود اکثر اہلحدیث علماء بھی تعویذ فروشی میں کسی سے پیچھے نہیں۔

۳۔ امام ابن حزم ظاہری

فرقۂ اہلحدیث کے ایک ترجمان ہفت روزہ اہلحدیث نے امام ابن حزم ظاہری کے بارے میں اپنی ۹ ستمبر کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا ہے۔ جس میں ان کی مشہور کتاب المحلّٰی کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

"المحلّٰی امام ابن حزم کی مایہ ناز تالیف ہے۔ اس میں آپ نے ہر مسئلہ کی بنیاد قرآن وحدیث اور آثار صحابہؓ پر رکھی ہے۔ امام صاحب ہر مسئلہ پر نہ صرف ائمہ اربعہ بلکہ اکابر سلف کا مسلک و مؤقف مع براہین ودلائل بیان کرتے ہیں۔ پھر ان میں سے جس کا مسلک ان کی نظر میں کتاب و سنت سے قریب تر ہوتا ہے، اس کو اختیار کرتے ہیں۔ اور جہاں نقد وجرح کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، بغیر کسی رُو رعایت کے دلائل سے تنقید کرتے ہیں۔ آپ نے مسائل میں اجتہاد کیا ہے۔ فروعات کو چھانٹا، فقہی مسائل کو مختلف شاخوں میں تقسیم کیا۔ المحلّٰی میں آپ نے مختلف قسم کی فروعات کا تذکرہ کیا ہے۔

امام ابن حزم تقلید کے سخت مخالف ہیں، اور شخص واحد کی تقلید کو حرام ٹھہراتے ہیں!"

(ہفت روزہ اہلحدیث بابت ۹ ستمبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۹)

امام صاحب کی اس مایہ ناز تالیف میں صرف تقلید کے بارے میں ہی نہیں لکھا بلکہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے، مثلاً اس کتاب کی جلد سات کے صفحہ ۳۵۸ پر ان تمام احادیث کو ضعیف اور جھوٹا ثابت کیا گیا ہے۔ جن کے حوالے سے ہمارے ہاں قربانی کا جواز ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ان غیر مقلد بھائیوں نے امام ابن حزم کی اس تحقیق کا کبھی نام تک نہیں لیا۔

۴۔ حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی صاحب

علمائے دیوبند کے پاکستانی ترجمان ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک کے ستمبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں جناب حسین احمد مدنی صاحب کے محاسن کے بارے میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا۔ جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے اتباعِ شریعت وسنّت کو نصب العین حیات بنالیا تھا۔ کوئی کام خلافِ شریعت وسنّت نہ خود کرتے اور نہ کسی کو کرتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ رسوماتِ قبیحہ میں شرکت کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ مباح رسومات میں بھی اس وقت تک شریک نہیں ہوتے تھے جب تک اس کو سنّت کے مطابق نہ کرا لیتے۔ مثلاً نکاح میں اس شرط کے ساتھ شرکت کرتے کہ اس میں سادگی کا پورا لحاظ رکھا جائے گا اور خود نکاح اس وقت تک نہ پڑھتے جب تک "مہرِ فاطمی" پر فریقین کو راضی نہ کر لیتے۔ ولیمہ بھی سنّت کے مطابق ہونا ضروری تھا ورنہ خود شریک نہ ہوتے تھے۔

(ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک بابت ستمبر ۱۹۸۸ء صہ ۳۲)

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس مضمون میں یہ بھی وضاحت کر دی جاتی کہ جناب حسین احمد مدنی صاحب نے کس شریعت کے اتباع میں قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی؟

۵۔ سگریٹ نوشی اور علماء

جب اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سگریٹ نوشی کا رواج ہوا تو تمام اسلامی ممالک کے علماء نے اس کے حرام ہونے کا متفقہ فتویٰ جاری کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مجموعۃ الفتاویٰ از مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی جلد اوّل صفحہ ۸۳، مطبوعہ شوکتِ اسلام پریس لکھنؤ ۱۳۰۹ھ)

لیکن ہمارے علماء حضرات نے اپنے سلفِ صالحین کے ان فتاویٰ کا کبھی نام تک نہ لیا۔ کچھ عرصہ پہلے، پاکستان کے سابق مرحوم صدر نے سگریٹ نوشی کے خلاف ایک مہم میں جب ایک تقریر کی تو حاضرین نے مطالبہ کیا کہ آپ سگریٹ نوشی پر ملک میں پابندی کیوں عائد نہیں کر دیتے۔ ان کا جواب تھا کہ یہ کمپنیاں بڑے اثر و رسوخ کی مالک ہیں اور ان کے پاس ٹنوں کے حساب سے دولت ہے۔ جب ان کے اس ارشاد کی مزید تحقیق کی گئی تو اصل حقیقت واضح ہو گئی۔ اس وقت ہمارے سامنے علمائے دیوبند کا مشہور رسالہ الحق کا ستمبر ۱۹۸۸ء کا شمارہ ہے۔ اس کے صفحہ ۵۸ اور ۶۴ پر سگریٹ کمپنیوں کے پورے ایک ایک صفحے کے دو اشتہارات ہیں۔ ان اشتہارات کے بعد ہمارے علماء کو اپنے سلفِ صالحین کے فتاویٰ بھول جائیں تو کیا عجب!

۶۔ اسلام کے نام پر سرمایہ دارانہ نظام کی علمبرداری

ہم کم از کم دو ہزار روپے تنخواہ دیں گے۔ (جماعتِ اسلامی)

حال ہی میں جماعتِ اسلامی پاکستان کا نئے انتخابات کے لئے منشور شائع ہوا ہے۔ خود جماعتِ اسلامی والوں کے نزدیک ان کے اس منشور کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ برسر اقتدار آکر مزدور کی کم از کم دو ہزار روپے تنخواہ مقرر کریں گے۔ انہوں نے اپنے منشور کی اس شق کو پاکستان کے طول و عرض میں دیواروں پر لکھ دیا ہے تاکہ ہر آتے جاتے کی اس پر نظر پڑے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو علمِ معاشیات کی مبادیات کا علم بھی نہیں۔ یا وہ ملک میں سرمایہ داری نظام کی جڑیں مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ اگر بالفرض انتخابات میں کامیاب بھی ہو گئے اور انہوں نے اپنے اس منشور پر عمل کیا تو اس سے کسی مزدور کو معمولی سا فائدہ بھی نہیں پہنچے گا۔ بلکہ اس کی زندگی پہلے سے بھی اجیرن ہو جائے گی۔ وہ یوں کہ تنخواہ کے اعلان ہی کے ساتھ اشیائے صرف کی قیمتیں اسی نسبت سے زیادہ کر دی جاتی ہیں اور جب مزدور تنخواہ گھر لے کر آتا ہے، تو اشیاء کے نرخ پہلے سے بھی بڑھ چکے ہوتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے اس وقت تک تنخواہوں میں پندرہ گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ پہلے زمانے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ کم تنخواہ میں ان کا اچھا گزارا ہو جاتا تھا۔ اب ان کی زندگی اجیرن ہو چکی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے جاہل لوگ بھی سمجھتے ہیں لیکن جماعتِ اسلامی کے ماہرین نہیں سمجھ سکے۔ شاید وہ اسلام کے نام پر اس ملک میں سرمایہ داری نظام کی جڑیں مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔

۷۔ خانہ کعبہ میں جی نہیں لگتا۔

ان دنوں تنظیم اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے ماہنامہ رسالے 'میثاق' میں، اپنی زندگی کے مختلف واقعات بیان کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ واقعات واقعی باعثِ عبرت ہیں۔ ایک واقعہ میں فرماتے ہیں:

"۱۔ عید کے دوسرے دن بخاری حضرات کی رباط میں مولانا بنوری سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو وہاں اچھی خاصی مجلس جمی ہوئی تھی۔ ادھر میں ایک ذاتی مسئلے میں مولانا سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتا تھا..... کافی انتظار کے بعد میں نے درخواست کر ہی دی کہ مجھے چند منٹ تخلیہ میں درکار ہیں۔ مولانا کمالِ شفقت و مروّت سے وہاں سے اُٹھ کر مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے

گئے..... وہاں میں نے عرض کیا کہ: "مولانا! میں بہت پریشان ہوں کہ میرا دل مسجدِ نبویؐ میں تو خوب لگتا ہے، مسجدِ حرام میں بالکل نہیں لگتا، اور ہزار کوشش کے باوجود وہاں دلجمعی حاصل نہیں ہوتی!"..... میری بات سن کر مولانا پر دفعتہً رقت طاری ہو گئی اور انہوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: "ڈاکٹر صاحب! آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایک دینی و روحانی معاملے میں رہنمائی چاہی ہے۔ ورنہ ہمارے پاس جو بھی آتا ہے دنیا ہی کے مسائل و مشکلات کا رونا رونے آتا ہے۔" ساتھ ہی انہوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ میرے لئے اپنے خصوصی اوقات میں صمیمِ قلب سے دعا کریں گے۔ میرے دل پر مولانا رحمہ اللہ کے خلوص و اخلاص اور سادگی اور صاف گوئی کا بہت اثر ہوا۔

(ماہنامہ میثاق لاہور بابت اگست ۱۹۸۸ء صـ ۳۴)

یہ عجیب رہنمائی ہے کہ ڈاکٹر صاحب مولانا بنوری سے اس بارے میں رہنمائی حاصل کرنے گئے کہ ان کا خانہ کعبہ میں جی نہیں لگتا۔ وہ رہنمائی کرنے کی بجائے خود رونے لگ جاتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب خوش ہو جاتے ہیں کہ شاید انہوں نے کوئی حقیقت دریافت کر لی ہے جس کا بنوری صاحب پر خاطر خواہ اثر پڑا۔ کیا اس واقعہ سے ڈاکٹر صاحب خانہ کعبہ کی حیثیت کم کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟

۸۔ حق ملکیت کے بارے میں فرقہ اہلحدیث کے خیالات میں انقلابی تبدیلی

محترم پرویزؒ صاحب قرآن مجید کی روشنی میں فرمایا کرتے تھے، کہ مسلمان اپنے مال و دولت کے مالک نہیں بلکہ امین ہیں۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد، انہیں اپنے مال کو دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلا رکھنا چاہیئے۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) اسوقت تو علماء حضرات نے پرویزؒ صاحب پر طعن و تشنیع کے تیر برسائے لیکن اب خود امام ابن حزم کے حوالے سے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"جو شخص پیاسا ہو اور اس کی وجہ سے موت کا ڈر ہو۔ تو اس کا فرض ہے کہ جس جگہ اور جس طرح سے پانی میسّر ہو حاصل کرے اگرچہ اس میں لڑائی کی نوبت ہی کیوں نہ آجائے لہٰذا یہ فرق کس طرح درست ہو گا کہ ایک شخص کو موت سے بچنے کے لئے پیاس بجھانے پر لڑائی تک کی اجازت دی جائے اور اسی شخص کو بھوک یا عریانی سے پیدا شدہ موت کے خوف سے

بچنے کے لئے قتال کی ممانعت کر دی جائے یہ بات اجماع، قرآن وسنت اور قیاس کے خلاف ہے۔

ابنِ حزم لکھتے ہیں۔

اگر ایک شخص کے پاس اپنی اصلی حاجت سے زائد زادِ راہ موجود ہے۔ اور دوسرا شخص بھوک سے اس قدر بے قرار ہے کہ موت طاری ہونے کا خطرہ ہے۔ تو اس مضطر کو مردار یا خنزیر کھانا جائز نہیں بلکہ اس کا حق ہے کہ زبردستی اس پر قبضہ کر کے صرف بقدرِ ضرورت استعمال کرے خواہ وہ مال مسلمان کا ہو یا ذمّی (غیر مسلم) کا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبِ مضطر کو یہ کہنا درست نہیں کہ وہ مردار یا سوٗر کا گوشت کھانے پر مضطر (مجبور) ہو چکا ہے۔ اس پر اس مضطر کو یہ حق حاصل ہے کہ اس معاملے پر قتال کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اگر وہ خود قتل ہو جاتا ہے، تو اس کے قاتل کو دیت ادا کرنا ہو گی اور اگر مزاحمت کرنے والے کو قتل کر دیتا ہے تو وہ کم بخت خدا کی لعنت کا مستحق ہو گا کیونکہ اس نے ادائے حق میں مزاحمت کی اور وہی باغی فریق ہے۔

اس موقف کے لئے دلیل اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے:

(پھر اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے فریق پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے گروہ سے جنگ کرو تاآنکہ وہ اللہ تعالےٰ کے فیصلہ کا تابع ہو جائے) (الحجرات: آیت ۹)

ان تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بلاشبہ اسلام ذاتی ملکیت کا حق دیتا ہے۔ مالک کو اپنی ملکیت کے محفوظ رکھنے اور دوسروں کو اس میں مداخلت سے روکنے کا پورا حق حاصل ہے لیکن چونکہ ملکیت خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، فی الجملہ حیاتِ انسانی کی بقا کے لئے دی گئی ہے لہٰذا جب یہ مقصود ہی خطرے میں پڑ جائے تو پھر ما وشما کی ساری حدبندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ سارے ذاتی حقوق بے معنی ہو جاتے ہیں اور ہر مال براہِ راست اپنے مقصودِ اصلی کے تابع ہو جاتا ہے۔

(ہفت روزہ اہلحدیث لاہور بابت ۱۲ اگست ۱۹۸۸ء صفحہ ۱)

۹۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا فہم حدیث

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں آپ معروف شخصیت کے مالک ہیں روزنامہ 'جنگ' ۶ مئی ۱۹۸۸ء صـ۳ پر آپ کا ایک مضمون بعنوان 'عظمت صوم' نظر سے گذرا اس میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔

متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خلق کے اعتبار سے سب پر مقدم ہیں آخر اس حدیث کی کیا توجیہہ ممکن ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "صحابہ کرام نے دریافت کیا یا رسول اللہ آپؐ کو نبوّت کب ملی۔؟ فرمایا اس وقت جب آدمؑ ابھی رُوح اور مٹی میں تھے (یعنے اُن میں رُوح نہیں پھونکی تھی)۔ (ترمذی بحوالہ ترجمان السنہ جلد اوّل)

گستاخی معاف! یہ سمجھنا بہت مُشکل ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کا ان کے عنوان "عظمت صوم" سے کیا ربط اور کیا تعلّق ہے۔؟ یہ نکتہ ڈاکٹر صاحب ہی حل فرما سکتے ہیں۔

البتہ حدیث کی توجیہہ کی بابت ہماری عرض ہے کہ:۔

صحابہ کرام کا سوال یہ نہیں تھا کہ آپؐ کی تخلیق کب ہوئی بلکہ انہوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ آپؐ کے نام نبوّت (خاتم النبیین) کا منصب کب لکھا گیا۔؟ حضورؐ نے فرمایا جب آدمؑ مٹی میں تھے۔

اس حدیث میں تخلیق کا مسئلہ قطعاً بیان نہیں ہوا نہ ہی صحابہ کرام کا یہ سوال تھا بلکہ نبوّت کب لکھی گئی کا سوال تھا اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب ارشاد فرمایا چنانچہ اس مضمون کی دوسری حدیث پڑھئے ارشاد ہے۔

اِنِّی عِنْدَ اللّٰہِ مَکْتُوْبٌ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ وَاِنَّ اٰدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِیْنَتِہٖ (مشکوٰۃ یا فضائل سید المرسلین)

یعنی میں اللہ تعالےٰ کے ہاں اُس وقت خاتم النبیّین لکھا ہوا تھا جب کہ آدمؑ ابھی مٹی میں تھے۔ دماغ پر ذرا بوجھ ڈال کر سوچئے کسی شئی کا اللہ کے دربار میں لکھا ہونا اور بات ہے اور اس کا وجود میں آجانا امر دیگر ہے۔

پس سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبِ خاتم النبیّین لکھا جانا تخلیقِ آدمؑ سے پہلے تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق (پیدائش) ۹ ربیع الاوّل ۱ عام الفیل مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء

بقیہ بر صفحہ ۷۱